تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتَابِ
وَقُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝

آیاتِ بیّنات

پروفیسر سید اللہ بخش الجیلانی

آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس

Marfat.com

تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ
وَقُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝

DATA ENTERED

آیاتِ بیّناتؒ

پروفیسر سید اللہ بخش الجیلانی

آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس
۷۔ فرینڈز کالونی، ملتان روڈ، لاہور۔

Marfat.com

297.18
26459
110641

نام کتاب	آیات بینات
مصنّف	پروفیسر سید اللہ بخش الجیلانی (مرحوم)
طبع اوّل	نومبر ۱۹۶۵
طبع دوم	اپریل ۱۹۸۸ء
طبع سوم	جون ۲۰۰۴ء
تعداد	چھ صد
قیمت	100 روپے
باہتمام	سعید احمد بدر
	مخزنِ اقبال پبلی کیشنز
	البدر 965- نظام بلاک علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔
ناشر	آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس
	۷۔ فرینڈز کالونی، ملتان روڈ، لاہور۔
کمپوزنگ	یونیک، لاہور۔ فون: 7582254

Marfat.com

ترتیب

نمبر شمار	نام عنوان	نمبر صفحہ
	تعارف از چوہدری مظفر حسین	7
	ابتدائیہ از بریگیڈیئر (ر) منظور احمد	8
	سرآغاز از ڈاکٹر عبدالحمید ملک	17
	تعارف از ڈاکٹر عبدالحمید ملک	18
	دعوت اِلی القرآن از پروفیسر سید اللہ بخش گیلانی	21
1	**حصولِ علم کے ذرائع**	29
۱۔	الف۔ قرآن کی آیات	
	ب۔ فطرت کی آیات	30
	ج۔ تاریخ کی آیات	
۲۔	علم بالوحی	31
۳۔	علم بالحواس	41
۴۔	علم بالتاریخ	43
۵۔	عقل وخرد	46
۶۔	عقل اور وحی	48

Marfat.com

نمبر شمار	نام عنوان	نمبر صفحہ
	کتب تفاسیر	59
	تنقیدِ تفسیر	60
3	"تفکر فی القرآن" کی راہ میں رکاوٹیں	66
	عرب تخیُّل	
	اوہامی شق	67
	شاعرانہ شق	68
	اسرائیلیات	69
	فلسفۂ یونان	70
	تقلید	72
	تفسیر بالرّائے	75
4	جمع وترتیب قرآن	79
	امامیہ کے اکابر علماء کی تصریحات	86
5	تفکر فی القرآن کے اساسی اُصول	89
۱۔	تفسیر آیات بالآیات	
۲۔	تفسیر آیات بالعلم	93
۳۔	قرآن میں نظم اور ربط	99

Marfat.com

نمبر شمار	نام عنوان	نمبر صفحہ
۹۔	عربیت کا صحیح ذوق	121
۱۰۔	علاماتِ وقف	123
۱۱۔	قرآنِ حکیم اور دیگر کتبِ سماویہ	125
6	**قرآن اور علمی نظریات**	135
-	حق اور باطل	
	حق و باطل کے مرکبات	136
	قانونِ تصادم	137
7	**مسئلہ ارتقاء**	140
	مسئلہ ارتقاء کی تین شقیں	144
	حقیقت ارتقاء	147
	ارتقاء اور قرآن	
	تدریج سنت اللہ ہے	148
	کائنات کا تدریجی ظہور	149
	قرآن تورات اور علم کی ہم آہنگی	150
	پیدائشِ سمٰوات	152
	زمین کی پیدائش	154
	جسم انسانی کی ابتداء	156
	افزائشِ نسل	157
	ایک اہم وضاحت	158
	ایک نئی مخلوق	161
	شجرِ ارتقاء	166
	علوم کی تائید	169

Marfat.com

نمبر شمار	نام عنوان	نمبر صفحہ
	علم الجنین کی تائید	174
	جدید تحقیقات	175
	قانون حیات کی عالمگیر وحدت	176
	مدارج تطور	
	قرآن کی تصریحات	178
	قرآن کا سترھویں صدی کے نظریہ سے انکار	179
	جدید مفسرین کی بے نتیجہ قطع و بُرید	
	قرآن اپنی جگہ سے نہیں ہلا مگر علم کو ہلنا پڑا	180
	قرآن کے مدارج ستّہ	
	علقہ کی تعبیر	182
	موافقین ومخالفینِ ارتقاء	184
	اور ہم نے	195
	علم اور امامت کا رشتہ	196
	تقسیم امامت کا رشتہ	197
8	**استفسارات**	201
	طبیعی علوم	
	(الف) مادی علوم	205
	(ب) حیاتیاتی علوم	206
	(ج) ذہنی یا نفسانی علوم	
	معیاری علوم	207
9	**قرآن قیامت تک انسان کا واحد دستور العمل ہے۔**	208

Marfat.com

تعارف

پروفیسر سید اللہ بخش گیلانی مرحوم آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس کے بانی اراکین میں سے تھے اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم مغفور کو آپ کی ذات گرامی سے خصوصی تعلق خاطر تھا۔ وہ آپ کے فہم قرآن کے قدردان اور مداح تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی وفات کے بعد آپ اسلامک ایجوکیشن کانگرس کے اکیڈیمک اور ایڈمنسٹریٹو ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ جب آپ گورنمنٹ کالج لاہور سے تبدیل اور کچھ عرصہ بعد سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو گئے تو آپ کو اپنے آبائی شہر ڈیرہ غازی خاں میں سکونت اختیار کرنا پڑی اور اکیڈیمک ایڈمنسٹریٹو ڈائریکٹر کے اعزازی عہدہ سے سبکدوش ہونا پڑا لیکن اس کے باوجود کانگرس کے علمی کاموں اور دیگر اُمور میں آپ بدستور دلچسپی لیتے رہے اور اس ادارہ سے آپ کا والہانہ لگاؤ دمِ واپسیں تک قائم رہا۔

''آیات بینات'' سید اللہ بخش صاحب کی تصنیف ہے جسے آج سے ربع صدی قبل ڈاکٹر عبدالحمید ملک مرحوم نے بڑے اہتمام سے شائع کروا کر مفت تقسیم کیا اور اس کے تمام اخراجات خود برداشت کیے۔ کانگرس کے بعض احباب کا تقاضا تھا کہ اسے دوبارہ شائع کیا جائے تاکہ سید صاحب مرحوم کی اس علمی کاوش سے لوگوں کے دلوں میں قرآن میں غور و فکر کی تحریک و تشویق کا کام جاری رہے۔ سید صاحب کے بڑے صاحبزادے جناب حسن مہدی صاحب کا بھی اصرار تھا کہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جائے چنانچہ ان احباب کے تقاضوں کے پیشِ نظر حکمت قرآن کے طالبین اور مشتاقین کے لئے کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین کرام ہماری اس پیش کش کو پسند فرمائیں گے۔

مظفر حسین

۸ جنوری ۱۹۸۸ء

آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس

۷۔ فرینڈز کالونی ملتان روڈ، لاہور۔

Marfat.com

ابتدائیہ

دین میں جس طرح ذکر مطلوب ہے، اِسی طرح فکر بھی مطلوب ہے۔ اگر ذکر ہو اور فکر نہ ہو تو بسا اوقات یہ ذکر زبان کا ایک شغل بن کر رہ جاتا ہے۔ اِس سے معرفت کے دروازے نہیں کھلتے۔ امام غزالیؒ نے اِسی لیے فرمایا کہ ''ابرار اور اتقیا کے درجات فکر ہی سے بلند ہوتے ہیں۔'' سورۃ آل عمران آیت ۱۹۵ میں اپنے بندوں کی یہ پہچان بتلائی گئی ہے کہ ''وہ لیٹتے اور اُٹھتے' بیٹھتے' اللہ کو یاد رکھتے اور اُس کا ذکر کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اُس کی بنائی ہوئی کائنات کے مظاہر پر غور و فکر کرتے ہیں۔''

علامہ بیضاوی فرماتے ہیں ''مظاہر کائنات پر غور و تدبر کرتے رہنا سب عبادتوں سے افضل ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ تدبر و تفکر کے ہم پایہ کوئی عبادت نہیں۔''

فکر کی درست (قرآنی) سمت کا تعین علامہ اقبالؒ نے اپنے چھٹے خطبہ میں کیا ہے جس کیلئے حضرت علامہؒ نے ''کائنات کی روحانی تعبیر'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اِسے ہم کائنات کی توحیدی تعبیر کے نام سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔ حضرت علامہ نے اِس خطبے میں نکتہ توحید کو مرکزی حیثیت دی ہے اور انسانی زندگی پر توحید کے عملی اطلاقات پر آپ نے بڑی خیال انگیز بحث کی ہے۔ علامہ اقبال کی ترجیحات میں سب سے پہلا کام کائنات کی روحانی تعبیر سے تعلق رکھتا ہے جس کا مطلب اِس کے علاوہ کچھ نہیں کہ کائنات کی تعبیر کرنے والے تمام علوم جنہیں عرف عام میں سائنس کہا جاتا ہے، اُنہیں اللہ جوئی، اللہ شناسی اور اللہ رسی کا ذریعہ بنایا جائے تاکہ وہ سائنسی علوم جو آج ہماری نسلوں کیلئے پامالئ عقائد کا باعث بن رہے ہیں، ہمارے لیے ایمان افروزی اور ایزادئ تقویٰ کا وسیلہ بن جائیں۔ اپنے ملک کے نظام تعلیم بلکہ دنیائے علم میں یہ انقلاب لانا ہماری اولین ضرورت ہے جس کیلئے علامہ اقبالؒ ایک زوردار نعرہ بلند کرتے ہیں۔

Marfat.com

اے مسلماں فغاں از فتنہ ہائے علم و فن

اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیر یاب

انقلاب و انقلاب اے انقلاب

کائنات کی روحانی تعبیر۔ اس تصور کا ماخذ قرآن حکیم ہے۔ احقر نے اپنی اکلوتی تصنیف ''پاکستان کے نظریاتی تقاضے فکر اقبالؒ کی روشنی میں'' مطبوعہ 1991ء میں اس تصور کا اجمالاً تعارف کروایا ہے۔ اِس نظریہ کا علمی احاطہ میرے بس کی بات نہیں۔ لہذا تحریر و تقریر اور قومی پریس کی وساطت سے اقبال شناسوں کی توجہ اِس موضوع کی طرف دلائی گئی کہ وہ اس اجمال کی تفصیل لکھیں۔ اس کے مضمرات پر روشنی ڈالیں۔ لیکن لاحاصل۔ حالانکہ حکومت کے خرچ پر کئی ادارے اقبال کے نام پر ''ماہرین اقبال'' کو پال رہے ہیں۔ ممکن ہے ہمارے ''ماہرین اقبال'' کی کچھ مجبوریاں ہوں۔ لیکن اقبال کو گالی دینا ان کی کوئی مجبوری نہیں۔ مثال کے طور پر سہ ماہی/رسالہ ''اقبالیات'' کے شمارہ مارچ 1997ء کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ یہ شمارہ پاکستان گولڈن جوبلی کی تقریبات کے سلسلے میں خطبات اقبالؒ کے خصوصی نمبر کے طور پر شائع کیا گیا۔ اِس میں کل نو مقالات شائع کئے گئے ہیں جن میں چار مقالے علامہ اقبال کی تنقیص و تصفیر پر مشتمل ہیں۔ دو مقالہ نگاروں نے اپنی نگارشات کی تان اِس بات پر توڑی ہے کہ خطبات میں علامہ اقبالؒ نے اجرائے نبوت کی راہ ہموار کی ہے اور یہ الزام اس شخصیت کو دیا جا رہا ہے جس کا عقیدہ ہے کہ

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک

''یہ ماہرین'' فکر اقبالؒ میں نقائص تلاش کرنے کو ہی کمال تحقیق خیال کرتے ہیں۔ یہ ملک اقبال کا چمنستان ہے۔ ان حضرات کی تحریریں نہ صرف جہالت کی

Marfat.com

عبارت ہیں بلکہ احسان ناشناسی اور عظمت ناشناسی کی مظہر ہیں۔

؎ وعظ کہتے تھے کوئی مسلم نہ انگریزی پڑھے
کفر ہے آغاز اِس بولی کا کفر انجام ہے
میں نے یہ سن کر کیا ان کو مخاطب اِس طرح
آپ کا ہونا بھی تو اک گردش ایام ہے [2]

آخر کار میری ناتمام خواہش پایہ تکمیل کو پہنچی۔

؎ چن لیا تقدیر نے وہ دل جو تھا محرم ترا

محبی برادرم چوہدری مظفر حسین کو یہ سعادت بخشی گئی اور اُنہوں نے اقبال اور روحانی جمہوریت کے نام سے ایک ''معرکتہ الآرا کتاب'' تحریر کی ہے جس میں فاضلانہ اور دل نشیں انداز میں حضرت علامہ کے تصورات کا علمی احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔ ان کی ایک مدت سے یہ آرزو تھی جو ''روحانی جمہوریت'' کی طباعت سے پوری ہوئی ہے۔

اقتباس از اقبال اور روحانی جمہوریت، از چوہدری مظفر حسین:

عصر حاضر میں انسان کی تین اہم ضرورتیں

''عالم انسان کو آج تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ '' کائنات کی روحانی تعبیر، فرد کا روحانی ترفع اور بنیادی اُصول جن کی نوعیت عالمگیر ہو اور جن سے انسانی معاشرے کا ارتقاء روحانی اساس پر ہوتا ہے۔''

اقتباس از علامہ اقبالؒ: فکر اسلامی کی تشکیل جدید:

---

[1] ''پاکستان کے نظریاتی تقاضے فکر اقبال کی روشنی میں'' مطبوعہ 1991ء

[2] ایک دلچسپ واقعہ قارئین کی پیش خدمت ہے علامہ اقبال کی شام کی سیر کے دوران دہلی دروازہ کے ایک مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جس کی تفصیل آپ کے غیر مطبوعہ کلام میں ملتی ہے۔

Marfat.com

کائنات کی روحانی تعبیر

''قرآنی تعلیمات کی رو سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار انسان کی فطرت میں پیوست اور عہد الست کی صورت میں اس کے لاشعور میں محفوظ ہے۔ موجودہ ارضی زندگی میں اسے شعوری سطح پر روبہ عمل لانے کیلئے قرآن حکیم کا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ اس کا طریقہ یہ بتلایا کہ کائنات میں اس کے مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کرے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی اس آیت کی صورت میں نازل ہوئی:

۱	۲	۳
اقرا	باسم ربک	الذی خلق

اس چھوٹی سی آیت کے تین اجزا ہیں اور ان میں ایک جامع فلسفۂ تعلیم بیان ہوا ہے۔ پہلا جزو 'اقرا' (یعنی 'پڑھ') کے حکم سے عبارت ہے۔ لہذا تعلیم حاصل کرنا ہر مرد وزن پر فرض ہے۔

دوسرا جزو 'باسم ربک' (یعنی 'اپنے رب کے نام سے) کی ہدایت ہے۔ اس ہدایت کی رو سے تعلیم کا مقصد اولیٰ (Ultimate Purpose) انسان میں اللہ شعوری اور توحیدی نقطۂ نظر پیدا کرنا ہے۔

تیسرا جزو 'الذی خلق' (جس نے یہ کائنات تخلیق کی) اللہ شعوری اور توحیدی نقطہ نظر پیدا کرنے کا طریقہ کار بیان کرتا ہے۔ قرآن کے نزدیک اللہ شعوری حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کائنات کو اللہ کی تخلیق سمجھتے ہوئے مظاہر فطرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا جائے۔ اللہ کی معرفت کا یہی نکتہ آغاز ہے' معرفت کے دیگر تمام مراحل اس کے بعد آتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

ے علم حق، اول حواس آخر حضور

Marfat.com

اس آیت کی تشریح ایک حدیث میں بڑی عمدگی سے بیان ہوئی ہے جو ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

''حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن مسجد میں تشریف لائے اور آپ نے صحابہ کرام کو متفرق حلقوں میں بیٹھے پایا جو مختلف علوم وفنون پر باہم مذاکرہ میں مشغول تھے:

آپ پہلے حلقے کے پاس کھڑے ہوئے۔ آپ نے ان کو قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول پایا۔ پہلے ان کے پاس بیٹھ گئے اور فرمایا ''میرے رب نے مجھے یہ چیز دے کر بھیجا ہے۔ پھر دوسرے حلقے کے پاس کھڑے ہوئے۔ یہ لوگ حرام کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ آپ ان کے پاس بیٹھ بھی گئے لیکن کچھ نہیں فرمایا۔ پھر آپ تیسرے حلقے کی طرف کھڑے ہوئے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی توحید کا ذکر کر رہے تھے اور اشیاء وامثال کی نفی کر رہے تھے۔ آپ بڑی دیر تک ان کے پاس بیٹھے رہے اور فرمایا ''میرے رب نے اسی بات کا حکم دیا ہے۔'' (**الجامع الصحیح فی طلب علم لغیر اللہ عزّوَجل**، مطبوعہ بیروت).

توحید کے ذکر اور اشیاو امثال کی نفی سے اس کے سوا اور کیا مفہوم مراد ہو سکتا ہے؟ کہ اس کائنات کی کوئی بھی شے قائم بالذات نہیں بلکہ اپنے وجود اور ہستی کے قیام کیلئے اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے اور اسی بات کو علامہ اقبال ''کائنات کی روحانی تعبیر'' کا نام دیتے ہیں۔

'کائنات کی روحانی تعبیر' سے علامہ اقبالؒ کی مراد یہ ہے کہ تمام سائنسی علوم کو توحید کے تصور کے ساتھ ملا دیا جائے۔ تمام سائنسی علوم کائنات کی تعبیر کرتے ہیں۔ کائنات کے بے شمار پہلو ہیں۔ ہر سائنس ان میں سے کسی ایک پہلو کا احاطہ اور مطالعہ کرتی ہے اور جو معلومات اس مطالعہ سے حاصل ہوتی ہیں انہیں مدون کر کے ایک علم یا سائنس کو تشکیل دیتی ہے اور کائنات کے اس خاص پہلو کی نسبت سے اسے موسوم کیا

Marfat.com

جاتا ہے۔ فزکس، کیمسٹری، باٹنی، زوالوجی، اسٹرانومی وغیرہ جتنے بھی علوم ہیں اسی طرح سے معرض وجود میں آئے۔

اسلام میں روحانی کمال تمام تر اس امر پر موقوف ہے کہ انسان میں اللہ شعوری کا داعیہ یعنی تقویٰ کس حد تک بیدار ہوتا ہے۔ تقویٰ کے کئی مدارج ہیں اور اس کا ایک اعلیٰ درجہ ''خشیت'' ہے جو اللہ تعالیٰ کے جلال و جمال کے ادراک کا نام ہے۔ سائنس اس ادراک کو تیز کرتی ہے۔ مشہور ماہر نفسیات ابراہم میزلو (Abraham Maslow) اپنی کتاب 'سائنس کی نفسیات' میں لکھتا ہے:

''درختوں کے بارے میں جوں جوں سائنسی علم ترقی کرتا ہے' اسی نسبت سے انسان کیلئے درختوں کے حسن اور خوبصورتی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ مجھے علم نباتات کی کچھ شد بد ہے اس لیے درخت میرے لیے ایک معجزے سے کم نہیں اور جوں جوں درخت کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ ہوتا جائے گا اسی نسبت سے درخت مجھے حسین سے حسین تر اور زیادہ معجزنما نظر آنے لگیں گے۔''

گویا مظاہر فطرت میں جمال وجلال کا یہ احساس اسلام کے نزدیک ایک خالصتاً روحانی تجربہ ہے جسے قرآن حکیم ''خشیت'' کا نام دیتا ہے۔ سورہ فاطر کی آیت نمبر ۲۷ اور ۲۸ میں مختلف مظاہر فطرت سے متعلقہ علوم مثلاً موسمیات (Metereology)، علم اثمار (Pomology)، علم طبقات الارض (Geology)، علم الانسان (Anthropology) اور علم الحیوانات (Zoology) کا مطالعہ کرنے والے اللہ کے بندوں کیلئے ''خشیت'' کی روحانی فضیلت کی بشارت دی گئی ہے جو ان مظاہر فطرت میں آیات الٰہی یا انوار الٰہی کا مشاہدہ کرنے کے صلے میں انہیں عطا کی جاتی ہے۔ ''خشیت'' اس حیرت پر خوشی کا نام ہے جو اللہ کے بندوں میں اپنے رب کے لیے بیک وقت محبت اور خوف اور خود اپنے بارے میں احساس بندگی اور عجز و فروتنی کے جذبات کو بیدار کرتی ہے۔ اسی لیے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ توحید کا نقطہ نظر اپنانے والے انسان

Marfat.com

کا ہر سائنسی تجربہ وعمل ایک طرح سے عبادت ہے کیونکہ وہ اپنے سائنسی مشاہدات و انکشافات کوانوار حق کی صورت میں دیکھتا ہے۔

کوہ و صحرا، دشت و دریا، بحر و بر
تختۂ تعلیم ارباب نظر
ہر چہ می بینی ز انوار حق است
حکمت اشیاء ز اسرار حق است

ترجمہ: ''پہاڑ ریگستان، جنگل، دریا، سمندر اور ارض خشک اہل نظر کے لیے (سائنسی) تحقیق وتعلیم کا میدان ہے۔ ان میں تجھے جو کچھ بھی نظر آتا ہے وہ اللہ کے انوار میں سے ہے اور سائنس کے علوم (حکمت اشیاء) اسرار خداوندی ہیں۔''

خرد دیکھے اگر دل کی نگاہ سے
جہاں روشن ہے نور لا الہ سے
فقط اک گردش شام و سحر ہے
اگر دیکھیں فروغ مہر و ماہ سے

لیکن سائنسی علوم اگر توحیدی نقطہ نظر اپنائے بغیر حاصل کیے جائیں تو علامہ اقبالؒ ایسے علوم کو کم بصری سے تعبیر کرتے ہیں:

وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

قرآن حکیم نے سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۹۱) میں اپنے بندوں کی یہ پہچان بتلائی ہے کہ ''وہ لیٹے اور اٹھتے بیٹھتے اللہ کو یاد رکھتے اور اس کا ذکر کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس کی بنائی ہوئی کائنات کے مظاہر میں غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔ ان میں انہیں اللہ کی نشانیاں نظر آتی ہیں۔'' اسی آیہ مبارکہ کی روشنی میں علامہ اقبالؒ ذکر اور فکر کے امتزاج کو روحانی تربیت کیلئے ناگزیر سمجھتے ہیں۔

Marfat.com

یہ سب ہیں ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے عَلَّمَ الاَسْمَاء
مقام ذکر کمالاتِ رومیؒ و عطارؒ
مقام فکر مقالاتِ بو علیؒ سینا
مقام فکرؒ ہے پیمائش زمان و مکاں
مقامِ ذکر سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی

مغرب میں سائنس کو اللہ کے عقیدہ سے الگ رکھا جاتا ہے کیونکہ وہاں عالم محسوسات کا معرفت خداوندی سے کوئی تعلق نہیں سمجھا جاتا، اوران کے نزدیک اللہ ایک نامشہود (Unseen) اورفوق الفطرت (Supernatural) ہستی ہے۔لیکن قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو ''ظاہر'' بھی کہا گیا ہے اور''باطن'' بھی۔اگر وہ ہستی ظاہر ہے تو غائب نہیں ہوسکتی۔اس لیے ڈاکٹر رفیع الدین فرماتے ہیں کہ ''قرآن کی آیت ''**یومنون بالغیب**'' کے لفظ **غیب** میں اللہ کو شامل کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ کی ہستی ہم سے کلیتہً مخفی ہستی ہے بلکہ ان معنوں میں مخفی ہے کہ مظاہر فطرت میں تو وہ ہستی آشکار ہے لیکن اس کی ذات ہماری جسمانی آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔لہذا مغربی فلسفہ سائنس میں اللہ کیلئے نامشہود (Unseen) اور فوق الفطرت (Supernatural) کے الفاظ جس طرح سے استعمال کیے جاتے ہیں، اسلامی فلسفہ سائنس میں ہرگز استعمال نہیں کیے جاسکتے۔اسلام میں اللہ کی ہستی کوئی ماورائے علم ہستی نہیں بلکہ ایک ایسی ہستی ہے جس کی شہادت علوم جدید (سائنسی علوم) بہم پہنچا رہے ہیں۔لیکن مغربی دنیا کے عیسائی سائنسدانوں نے کائنات کے مشاہداتی علوم کا رشتہ اللہ کے عقیدے سے منقطع کردیا۔درحقیقت سائنس اور سائنسدانوں سے کلیسا کی گہری اور آشکار دشمنی اور ایک طویل تاریخی چپقلش اس رویہ کو مزید تقویت پہنچاتی رہی جس کے نتیجے میں سائنسی علوم میں سے اللہ کا نام سرے سے ہی خارج کردیا گیا۔''

Marfat.com

یہ کتاب سترہ ۱۷ سال بعد چھپی ہے اور آج کے زمانہ میں اِس کی بے حد ضرورت ہے۔ کیونکہ قرآن فہمی کیلئے یہ ایک مستند اساس مہیا کرتی ہے اور عصر حاضر کی نوجوان نسل کی غلط فہمیوں کا تدارک اِس کا اصل مقصود ہے۔

بریگیڈیئر (ر) ڈاکٹر منظور احمد
ڈائریکٹر اسلامک ایجوکیشن کانگریس
۴ جون ۲۰۰۳ء

Marfat.com

سرآغاز

قرآنِ حکیم کی انمول امانت تو اس لئے آپ کے سپرد کی گئی تھی کہ اس کے درس فکر سے ہر مسلم قانت کی تشنہ لبی دُور ہو۔ ہر فرزند اسلام کو اپنی زندگی کا دستور العمل معلوم ہو جائے۔ فاران کی چوٹیوں پر نزولِ الہام تو اسلیئے ہوا تھا کہ یہ مسلمانوں کیلیئے قانونِ اساسی کا کام دے اور فرزندانِ توحید شہداء علی الناس بن جائیں۔ خلافتِ ارضی کے جائز وارث بن سکیں اور یہ ایک ہی طریق سے ہوسکتا ہے کہ آج ہی سے ہم یہ تہیہ کرلیں کہ جب تک ہماری آنکھوں میں بصارت، کانوں میں قوت سماعت، زبان میں قوتِ گویائی باقی ہے اور پاؤں میں سکت ہے تو ہر ایک مسلمان کا فرضِ اوّلین ہے کہ قرآن کریم کو پڑھے اور پڑھائے، سمجھے اور سمجھائے۔ عمل کرے اور کرائے۔ سر میں سودا ہو تو اس کا، دل میں عشق ہو تو اس کا اور پاؤں میں زنجیر و سلاسل ہوں تو اس کی محبت کے، کہ یہی مومن کا مقصدِ حیات ہے۔ ہمارے بزرگوں نے یہی کیا۔ یہ جہانِ مہر و ماہ، یہ چاند ستارے، اُن کے فتراک کے ادنیٰ نخچیر تھے۔ لوح و قلم تک ان کے حوالے کئے گئے۔ اس باب میں جب لغزش ہوئی تو خدائے بے ہمہ و باہمہ نے انہیں حرفِ غلط کی طرح مٹادیا۔ قرآن نے ہر مومن کا فریضۂ زندگی تو یہ قرار دیا ہے کہ وہ تمام عمر قرآن کا مبلغ رہے اور قرآن کی پاک آواز کو دنیا کے آخری کناروں تک پہنچاتا رہے۔ اسی لئے اعلان فرمایا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ. (آل عمران۳:۱۰۴)

ترجمہ: ''لوگوں کی راہنمائی کیلیئے جتنی امتیں پیدا ہوئی ہیں اُن میں تم سب سے بہتر ہو کہ اچھے کام کرنے کو کہتے ہو اور بُرے کام کرنے سے روکتے ہو۔''

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ. (البقرة:۱۴۳)

ترجمہ: ''اور اس طرح تم کو امت وسط بنایا کہ تم لوگوں کی راہنمائی کرسکو۔''

عبدالحمید ملک مرحوم

اقتباس از دیباچہ ''آیات بینات'' طبع اول

---

۱ دیباچہ اوّل سے اقتباس

Marfat.com

تعارف

انجمن تہذیب الاسلام گلبرگ نے سکیم نمبر ۲ کی جامع مسجد میں قرآنِ حکیم کے درس کا اہتمام کیا۔ یہ درسِ قرآنِ حکیم کے شارح و مُفکر محترم سید اللہ بخش گیلانی پروفیسر فلسفہ گورنمنٹ کالج لاہور دیتے ہیں۔ اُن کا افتتاحی خطاب ''دعوت الی القرآن'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مقدمہ تفسیر قرآن اُن کے اُن لیکچروں کا مجموعہ ہے جو سورۃ فاتحہ کی تفسیر شروع کرنے سے قبل انہوں نے دیئے جو کہ درسِ قرآن حکیم کیلئے اساس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ''دعوت الی القرآن'' کے آخر میں اِن کے عنوانات لکھ دیئے گئے تھے۔ ان کا مطالعہ کرتے وقت حسبِ ذیل امور پیش نظر ہیں۔

۱۔ یہ پروفیسر سید اللہ بخش گیلانی کے لیکچروں کا مجموعہ ہے جو کہ ترتیب دیا گیا ہے۔ درس کی زبان اور تصنیف و تالیف کی زبان میں فرق ہوتا ہے۔ ''مقدمہ تفسیر قرآن'' درس کی زبان میں ہے۔ تصنیف و تالیف کی زبان میں نہیں۔

۲۔ اِن لیکچروں کا موضوع مختلف عنوانات ہیں جو مختلف نشستوں میں دیئے گئے۔ ایک عنوان کا دوسرے سے ربط ضروری نہیں۔ ان عنوانات پر مشتمل لیکچروں کو اسی ترتیب سے مرتب کیا گیا جس ترتیب سے درس دیا گیا۔ اسلئے اس مقدمہ میں ابواب و فصول والی کتابی ترتیب آپ کو نہیں ملے گی۔

۳۔ درس کے اندر موقع و محل کی مناسبت سے یا سامعین کے مطالبہ و وضاحت اور رفع شکوک کے پیش نظر ایک بات کو دوبار بلکہ کئی بار بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس مقدمہ میں اس قسم کی تکرار سے آپ کو واسطہ پڑے گا۔ ایک موضوع یا ایک تقریر یا تقریر کے کسی حصے یا فقروں یا جملوں کو آپ ایک سے زیادہ مرتبہ موجود پائیں گے۔ اُسے ناگوار محسوس نہ کریں۔

۴۔ ''مقدمہ تفسیر قرآن'' میں چند عنوانات کے تحت علمی اور فلسفیانہ حقیقتیں بھی

Marfat.com

زیرِ بحث آئی ہیں۔لیکن ان علمی یا فلسفیانہ حقائق کی توضیح صرف اس حد تک کی گئی ہے جتنی کہ اس مقام پر محل و موقع کی مناسبت سے ضروری تھی۔اُن کے باقی غیر متعلق پہلوؤں کا عمداً ذکر نہیں کیا گیا کہ وہ ایک عام سامع یا قاری کے ذہن پر بوجھ کا باعث نہ بنے۔

۵۔ ''مقدمہ تفسیر قرآن'' میں دوسرے اصحابِ علم کے اقتباسات بھی دیئے گئے ہیں۔کوشش یہ کی گئی ہے کہ اقتباسات کافی حاشیہ چھوڑ کر دُوسرے قلم سے لکھے جائیں۔لیکن کاتب کی غلطی سے وہ اقتباسات نمایاں محسوس نہیں ہوتے۔تاہم کتاب یا مصنف کا نام نیچے لکھ دیا گیا ہے۔اگر کسی مصنف کے اقتباس کا حوالہ رہ گیا ہو تو طبع ثانی کے وقت دے دیا جائیگا۔

۶۔ بعض اقتباسات بہت طویل ہیں۔وہ عمداً اُسی طرح دیئے گئے ہیں کیونکہ ہمارا مقصد قرآنی حقائق و بصائر کی اشاعت و تبلیغ ہے۔

۷۔ ''مقدمہ تفسیر قرآن'' کے بعد تفسیر سورۃ فاتحہ انشاء اللہ تعالیٰ شائع کی جارہی ہے جو کہ زیرِ کتابت ہے، اس کے بعد اس سلسلہ کی مطبوعات کی ضخامت زیادہ نہ ہوگی۔اس کے صفحات اتنے ہوں گے کہ ایک ہی نشست (Sitting) میں آسانی سے پڑھے جاسکیں۔

۸۔ ہماری مطبوعات میں قرآن حکیم کی تشریح و تفسیر سے متعلق اگر کوئی دینی یا علمی پہلو تشنہ رہ گیا ہو یا وضاحت طلب ہو تو مندرجہ ذیل پتہ پر ہمیں لکھیں۔انشاء اللہ تعالیٰ وہ کمی اس سلسلہ مطبوعات کی اگلی ہی اشاعت میں پوری کردی جائے گی لیکن ہم کسی مذہبی بحث میں نہیں پڑینگے۔

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں　　فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

۹۔ یہ مقدمہ آج سے چھ ماہ قبل شائع ہو چکا ہوتا لیکن کاتب کے غلط رویہ کی وجہ

Marfat.com

سے اسے التواء میں ڈالنا پڑا، پھر کتابت کے مکمل ہو جانے کے بعد جب غلطیاں دیکھیں، اُردو عبارت میں بے شمار غلطیوں کے علاوہ قرآن حکیم کی ایک آیت بھی صحیح نہیں لکھی تھی اعراب کی غلطیوں کے علاوہ الفاظ غلط لکھے تھے۔ ہر آیت کو دوبارہ لکھنا پڑا۔ پہلا کاتب چونکہ رقم لے چکا تھا۔ اسلئے تصحیح کرنے سے گریز کرتا رہا اور ٹالتا رہا۔ آخر تنگ آ کر ایک اور کاتب کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اب ایک کاتب مستقل مل گیا ہے اسلئے آئندہ انشاء اللہ تعالیٰ بلا تاخیر یہ سلسلہ اشاعت جاری رہے گا۔

۱۰۔ قرآنِ حکیم کے حقائق و بصائر کی اشاعت و تبلیغ ہمارے پیش نظر ہے۔ اس لئے ہم نے یہ سلسلہ مطبوعات شروع کیا ہے۔ ان مطبوعات کی تقسیم مفت ہوگی۔ آپ کو ہمارے سلسلہ مطبوعات کی شائع شدہ کتب و رسالے پہنچ جائیں گے۔ خط و کتابت مندرجہ ذیل پتہ پر کریں۔

ڈاکٹر عبدالحمید ملک شارع ''الاسلام''
۴۲ مین گلبرگ کالونی لاہور۔

۲۴ رجب المرجب ۱۳۸۵ھ
۱۹ نومبر ۱۹۶۵ء

Marfat.com

دعوت اِلی القرآن

قرآنی تعلیمات کی اشاعت و تبلیغ مسلمانوں کا قومی عشق تھا۔انہوں نے جو کچھ کیا صرف اسی کیلئے کیا۔اُن کی تاریخ محامد و فضائل میں جو کچھ بھی ہے صرف اسی کیلئے ہے۔انہوں نے اپنے وطن و دیار کو خیر باد کہا تو اسی کیلئے،اعزّہ و اقربا سے دوری و مہجوری اختیار کی تو اسی کی خاطر، مال و دولت لٹایا تو اسی کی یاد میں، ان کی تلواریں بے نیام ہوئیں تو اسی کی صولت و حشمت کا سکہ بٹھانے کیلئے اور اُن کی گردنوں کا خون بہا تو اسی کے عشق میں، اُن کی قومی زندگی کی عام صدا یہی تھی!

اِنَّ صَلاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. (انعام : ۱۶۳)

ترجمہ:''بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب خالص اللہ ہی کیلئے ہے جو کہ سارے جہان کا مربی ہے۔''

لیکن انقلابِ زمانہ سے آج اُسی قوم کی یہ حالت و کیفیت ہوگئی ہے کہ قرآن کی دعوت کی راہ میں ایثارِ نفس اور فدویتِ جسم و جان کی توقع تو کیا کی جائے، مال و دولت کے کسی حقیر سے حقیر حصے کا صرف و انفاق اور اُس کے مطالعہ کیلئے وقت و فرصت کا نکالنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔حدیث شریف میں آتا ہے کہ''میری اُمت پر ایک وقت ایسا آئے گا جب کہ ایک چھوٹی سے چھوٹی نیکی اتنے اجر و ثواب کا موجب ہوگی جس قدر بڑی سے بڑی نیکی سے آج ثواب حاصل ہوتا ہے۔'' کیونکہ جب تاریکی بہت بڑھ جائے اور روشنی کی تمام قندیلیں بجھ جائیں تو اُس وقت دیا سلائی کی ایک تیلی بھی بہت قیمتی ہوتی ہے اور ایک ٹمٹماتا ہوا دیا بھی میسر آجائے تو اُسے بجلی کے لیمپ سے بڑھ کر لوگ غنیمت سمجھتے ہیں۔ یقیناً وہ وقت آگیا ہے۔تاریکی ہر طرف محیط ہے مگر

Marfat.com

روشنی کا کوئی سامان نہیں کرتا۔ ایسی حالت میں اگر کسی طرف سے ایک ہلکی سی شعاع بھی نظر آجائے تو اُس کی ویسی ہی عزت کرنی چاہیئے جیسی روشنی کے وقت میں کسی قیمتی سے قیمتی فانوس کی کیا کرتے ہیں۔

اگر ایک شخص مسلمانوں کی موجودہ تمام تباہ حالیوں اور بربادیوں کی علتِ حقیقی معلوم کرنا چاہے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگادے کہ صرف ایک ہی علت اصلی بیان کی جائے جو تمام علل و اسباب پر حاوی اور جامع ہو تو اُسے بتایا جاسکتا ہے کہ وہ علت ہے۔ علمائے حق کا فقدان اور علمائے سوٗ اور مفسدین کی کثرت۔

رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَعَادَتَنَا وَ كُبَرَاءَ نَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلاً۔ (احزاب ۳۳ : ٦٧)

ترجمہ: اور آگ کے ڈر سے لوگ پکار اُٹھیں گے کہ اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور بزرگوں کا کہا مانا تھا سو انہوں نے ہم کو سیدھے راستے سے گمراہ کیا تھا۔

اور پھر یوں ہے کہ ایک ہی جملے میں اس کا علاج کیا ہے؟ تو اسے حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ میں جواب ملنا چاہیئے کہ اُمت کے آخری عہد کی اصلاح کبھی نہیں ہوسکے گی تاوقتیکہ وہی طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے کہ اُس کے ابتدائی عہد نے اصلاح پائی تھی اور وہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآن حکیم کے اصلی و حقیقی مُعارف کی تبلیغ کرنے والے پیدا کیے جائیں جو دعوت اِلی القرآن دے سکیں۔

بڑی مصیبت یہ ہے کہ قرآن حکیم کی تعلیمات کریمہ کے جو حقیقی معارف و بصائر تھے اور جن مقاصد عظمٰی کیلئے اس کا نزول ہوا تھا وہ صدیوں سے بالکل بُھلا دیئے گئے ہیں اور یقیناً وہ وقت آگیا ہے جس کی نسبت کہا جاتا تھا کہ قرآن کے انوار و برکات اُٹھالئے جائیں گے اور جب لوگ تلاوت کیلئے قرآن کھولیں گے تو اُس کے اوراق کو بالکل سادہ اور غیر منقوش پائیں گے۔ یہ سچ ہے کہ الفاظ وحروف ابھی نہیں اُٹھالئے گئے لیکن بلاشبہ اس کے معانی و معارف تو ضرور اُٹھالئے گئے ہیں اور گو کاغذ پر لکھے ہوئے نقوش محو نہیں ہوئے مگر دلوں کے صفحات یقیناً سادہ رہ گئے ہیں۔

١١٥٦٤١

Marfat.com

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يَارَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْ هٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُوْرًا. (فرقان ۲۵ : ۳۰)

ترجمہ: ''اور قیامت کے روز رسول ﷺ کہیں گے کہ اے میرے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو بالکل ترک کردیا تھا۔''

اور یہ سب کچھ اسی لئے ہے کہ قرآن کے انوار و برکات عوام اُمت ہی سے سلب نہیں ہوئے بلکہ اُن لوگوں کے دلوں سے بھی محو ہو گئے ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں عوام کی ہدایت اور تمام عالم کیلئے قرآن کی تبلیغ تھی جب خود خواصِ اُمت اور اصحابِ درس و علم کو قرآنِ حکیم سے اس قدر بُعد و ہجر ہو جائے کہ جلالین و بیضاوی کے سوا اور کچھ نہ دیکھ سکیں اور مدارک و خازن سے الگ ہو کر ایک آیت پر بھی تدبر نہ کر سکیں تو پھر ظاہر ہے کہ عام مسلمانوں کے فہم و بصیرت کا کیا حال ہوگا؟

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

ترجمہ: ''وہ جو خود گمراہ ہے وہ کسی دوسرے کی رہنمائی کیسے کر سکتا ہے؟''

قرآنِ حکیم نے ان لوگوں کے بارے میں کہا تھا کہ ایمان باللہ والیوم الآخر سے محروم ہیں۔

وَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا. (بنی اسرائیل : ۴۵)

ترجمہ: ''اور جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اُن کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیتے ہیں۔''

افسوس کہ آج مدعیان ایمان و علم کا بعینہ یہ حال نظر آتا ہے۔

عار دارد کفر از ایمانِ من

ترجمہ: ''میرے ایمان کی یہ حالت ہے کہ کفر کو اُس پر شرم آتی ہے''

حضرات! قرآنِ حکیم کے معارف و حِکَم کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں تہذیب الاسلام کے اراکین اور بالخصوص محترم ڈاکٹر عبدالحمید صاحب ملک کی مساعی جمیلہ لائق

Marfat.com

تحسین اور قابل صد مُبارکباد ہیں کہ انہوں نے قرآنِ حکیم کے درس کی بنیاد ڈالی۔ قرآنِ حکیم کا درس عموماً مساجد میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ ایک نئے درس کا محض برکت کی خاطر اضافہ کرنا وقت اور محنت کا صحیح مصرف نہیں۔ اس راہ میں اگر کوئی مزید کوشش معقول ہوسکتی ہے تو یہ کہ کسی ایسی کمی کو پورا کیا جائے جو پہلے رہ گئی ہو یا طالبین قرآن کی ایسی ضرورت کو پورا کیا جائے جو پہلے پوری نہ ہوتی ہو۔ ہمارے پیش نظر ایسے تعلیم یافتہ احباب کی ضروریات ہیں جن کیلئے موجودہ دَور میں اپنی کثیر مصروفیات کے باعث علومِ قرآن کے وسیع ذخیرہ سے استفادہ ممکن نہیں۔

ہمارے پاس قرآنِ حکیم کے جو اُردو ترجمے ہیں یا ہماری مساجد کے خطبوں اور درسوں میں قرآنِ حکیم کا جو ترجمہ وتشریح پیش کی جاتی ہے اُن میں مجتہدانہ بصیرت تو ایک طرف رہی، تحقیق کا کوئی بھی پہلو نہیں ہوتا۔ اگر کسی ایک لفظ کے کئی معانی اور مفاہیم ہوں تو مترجمین وشارحین اصحاب صرف اُس مفہوم کو لیتے ہیں جو قرآن کی عبارت کو سب سے زیادہ بے معنی اور بے ربط بناتا ہو۔ مثال کے طور پر سورۃ التین کو لیجئے اُس میں تین اور زیتون سے مُراد انجیر اور زیتون کے عام پھل ہی لئے جاتے ہیں۔ پھر اُن کے طبّی فوائد گنائے جاتے ہیں کہ انجیر قاطع بلغم ہے۔ ملیّن طبع ہے، مسمّن بدن ہے۔ زیتون کھانے کے کام آتا ہے۔ اس کے تیل کو جلا کر روشنی حاصل کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ کیا دوسرے پھل طبّی فوائد سے خالی ہوتے ہیں؟ یا اُن کے اندر حیا تین نہیں کہ دوسرے پھلوں کو چھوڑ کر ان کا ذکر کیا گیا۔ سورۃ والتّین، کا عمود جزا کا اثبات ہے۔ مقسم بہ اور مقسم علیہ میں معنوی ربط کیا ہے؟ انجیر اور زیتون کے پھلوں کے جو مادی فوائد ہیں اُن کا جزا کے اثبات کے ساتھ کیا تعلق ہے کہ اُن سے استشہاد کیا گیا ہے؟ حالانکہ ابن جریرؒ نے حضرت عکرمہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ تین اور زیتون دو پہاڑ ہیں۔ تین وہ جگہ ہے جہاں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی دعوتِ کا

Marfat.com

اعلان فرمایا۔عرب بھی اُسے ایک پہاڑ کی حیثیت سے ہی جانتے تھے۔مشہور شاعر نابغہ ذُبیانی نے اپنے اشعار میں اس کا ذکر کیا ہے اور کوہِ زیتون کا ذکر تو انجیل میں بار بار آتا ہے۔حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق لوقا میں ہے:۔

''اور دن میں وہ ہیکل میں تعلیم دیتا تھا اور رات میں نکل جاتا تھا اور اس پہاڑ میں شب بسر کرتا تھا جس کا نام کوہِ زیتون ہے''۔

جس طرح طورِ سینین اور بلد امین دو مقامات ہیں اسی طرح تین اور زیتون بھی دو مقامات ہیں۔ یہ چاروں مقامات ایسے ہیں جہاں جزا کے اہم واقعات پیش آئے۔ اس لئے ان کو بطور شہادت پیش کیا۔تفصیل اس کی سورۃ والتین کی تشریح کے وقت پیش کیا جائے گی۔سورۃ المدثر کو لیجئے اس کے معنی چادر اوڑھنے والے کیلئے گئے ہیں۔ دثار کے معنی چادر کے بھی ہوتے ہیں لیکن اس کے معانی انسانیت کی اصلاح کرنے والے اور عالم کو درست کرنے والے کے ہیں۔رُوح المعانی اور فتح القدیر میں یہی معانی بیان کئے گئے ہیں۔قاضی سلیمان منصور پوری نے اپنی مشہور تصنیف رحمتہ اللعالمین میں ان ہی معانی کو اختیار کیا ہے۔منتھی الارب مادہ دثار میں ہے

ازدثر الطائر تدیثراً ''درست ساخت طائر آشیانۂ خودرا۔''

ترجمہ: ''پرندے نے اپنے آشیانہ کو درست بنایا۔''

علامہ ابوالمسعود اپنی تفسیر جلد ہشتم میں لکھتے ہیں **مدثر ایے و ثر هذا لامور العظیم و عصب به۔**

اب سورۃ مزمل کو لیجئے۔مزمل کے معنی کپڑا اوڑھنے والے کیا گیا۔کشاف۔ رُوح المعانی فتح القدیر میں اس کے معنی نبوت کا بوجھ اُٹھانے والے کئے گئے ہیں۔ مزّمل بوجھ کو کہتے ہیں اور جہاں تک کپڑا اوڑھنے والے **مزّمل** کا تعلق ہے۔ امام راغب نے لکھا ہے کپڑا اوڑھنے والا استعارہ ہے اور یہ کنایہ ہے عمل اور کام

Marfat.com

میں کوتاہی کرنے والے کیلئے **وذالک علی سبیل الاستعارہ کنایہ عن المقصر و متھاون اباالاھر و تصریضاً** اور زمیل اُس آدمی کو کہتے ہیں جو کمزور اور ناتواں ہو۔ **تابّط شرّاً** کی ماں نے اُسے کہا تھا لیس **بزمیل شروب للعیل** ''وہ سُست اور شرابی نہیں ہے جو ہر وقت عیل شراب پیتا رہتا ہو۔'' اب کپڑے کا اوڑھنا خواہ وہ چادر ہو یا کملی ہوا یسی چیز نہیں ہے جو کہ رسول پاک ﷺ کی امتیازی حیثیت قرار پا سکے۔ کیونکہ چادر یا کپڑا دوسرے لوگ بھی اوڑھتے ہیں۔ تو لازماً یہ ایک استعارہ و کنایہ ہے جیسا کہ امام راغب نے لکھا ہے۔ کسی نبی کے متعلق یہ گمان تک نہیں ہوسکتا کہ وہ کاہل، غافل یا فرائضِ رسالت میں کوتاہی کرنے والا ہو۔ پھر وہ رسول جو انسانیت کا اس قدر ہمدرد اور خیر خواہ ہو جسے وحی الٰہی نے خود ''حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ'' کے خطاب سے نوازا ہو اور بار بار تاکید کی ہو کہ:۔

وَمَا كَانَ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ. (یوسف : ۱۰۳)

ترجمہ: ''اور اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے گو آپ اُن کے ایمان لانے پر کتنے ہی حریص کیوں نہ ہوں۔''

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدَاهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ مَنْ يُّضِلُّ. (شعرا ۳۶ : ۳۷)

ترجمہ: ''اے نبی ﷺ! آپ کو اُن کی ہدایت کا اس قدر خیال ہے کہ شاید آپ اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے کہ وہ ایمان کیوں نہیں لاتے۔''

اور جس کے متعلق خود قرآن شہادت دیتا ہو کہ:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ. (شعرا ۲۶ : ۳)

''وہ کپڑا اوڑھنے والا'' مزمل دوسرے معنوں میں بقول امام راغب عربی زبان کے استعارہ کے مطابق المقصر اور متھاون بالاھر یعنی عمل میں کوتاہی کرنے والا نہیں ہوسکتا۔ یہ مثالیں پیش کرنے سے مقصد کسی کی تنقیص نہیں بلکہ جو حضرات عدیم الفرصت ہونے کے باعث مطالعہ نہیں کر سکتے اُن پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ تفسیر کے ذخیرے میں یہ باتیں بھی مذکور ہیں۔

Marfat.com

سورۃ فاتحہ کو شروع کرنے سے پہلے چند باتیں بطور تمہید پیش کی جائیں گی جو اس درس کیلئے ایک اساس کی حیثیت رکھتی ہوں گی۔ ابتدائی نشستیں ہی تمہیدی گفتگو پر مشتمل ہوں گی۔ اس سلسلے میں چند عنوانات پیش کئے جاتے ہیں تاکہ آپ کو ایک اندازہ ہو جائے کہ ابتدائی نشستوں میں گفتگو کا موضوع کیا کیا مباحث ہوں گے؟

(۱) حصول علم کے ذرائع (۲) علم بالوحی (۳) علم بالحواس (۴) علم بالتاریخ (۵) عقل کا مقام (۶) وحی اور عقل کے باہمی تعلق کی اہمیت (۷) قرآن کے لفظ کی لغوی تحقیق اور اس کا مفہوم (۸) تفکر فی القرآن کی اہمیت (۹) تاریخ تفسیر (۱۰) تفسیر کے مختلف طریقے (۱۱) تفکر فی القرآن میں رکاوٹیں (۱۲) کیا قرآن آسان ہے؟ (۱۳) تفکر فی القرآن کے بنیادی اصول (۱۴) قرآن کا اسلوب بیان (۱۵) قرآن میں نظم اور ربط (۱۶) نسخ آیات اور شانِ نزول کا صحیح مفہوم (۱۷) محکمات اور متشابہات کی حکیمانہ تقسیم (۱۸) قرآن کا تصور حیات اور نظریہ کائنات اور اُن کا دوسرے تصورات و نظریات سے مقابلہ۔

اس درس میں انشاء اللہ تعالیٰ یہ حقیقت ریاضیاتی حیثیت سے سامنے آتی جائے گی کہ قرآنِ حکیم ہر شعبہ حیات میں رہنمائی اور علم و حکمت کے اعتبار سے قیامت تک ہر زمانے کیلئے ایک عظیم ترین اور مکمل ترین کتاب ہے۔ جو اصحاب آج تشریف لائے ہیں اُن کی خدمت میں یہ استدعا ہے کہ آپ باقاعدگی کے ساتھ اِس درس میں تشریف لایا کریں تاکہ ربط و تسلسل نہ ٹوٹنے پائے۔ اپنے احباب کو بھی شمولیت کی دعوت دیں اور اس حلقہ کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کی کوشش جاری رکھیں۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ آپ حضرات کے تعاون اور کوششوں سے گلبرگ کے علاقہ میں قرآن اکیڈمی قائم کی جائے۔ اس کے متعلق تجاویز پوری تفصیل کے ساتھ پھر پیش کروں گا۔

اس درس کے متعلق بے شک یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اُن اصحاب کے لئے ہو گا جو

Marfat.com

Post Graduate Level پر قرآن حکیم کا مطالعہ کرنا چاہتے ہوں۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ مگر جو اصحاب قرآن فہمی سے عشق اور لگن رکھتے ہوں تو وہ زیادہ تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود بھی اُن کا ذہن قرآنی معارف کے اخذ و حفظ کی صلاحیت رکھتا ہے کیونکہ ایک طالبِ صادق اپنے جوش و اخلاص سے اُن تمام نقصوں کو پورا کرسکتا ہے جو کتابوں کے پڑھنے اور مدرسوں کی نشست میں رہ گئے ہوں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ ایک طالب مخلص اپنے پاس وہ چیز رکھتا ہے جو مدرسوں کے کمروں میں نہیں ملتی۔

از منطق و حکمت نہ کشاید در معشوق
ایں ہا ہمہ آرائش افسانۂ عشق است

یعنی "حکمت اور منطق سے معشوق اور محبوب کا دروازہ وا نہیں ہوتا کیونکہ یہ سب چیزیں اور تمام آرائشیں عشق و محبت کے افسانہ اور درد و سوز و گداز کی کہانی ہی کیلئے ہیں۔"

پروفیسر سید اللہ بخش گیلانی

Marfat.com

حصولِ علم کے ذرائع

''دعوت الی القرآن'' کے آخر میں میں نے کہا تھا کہ قرآن حکیم کو شروع کرنے سے پہلے چند باتیں بطور تمہید پیش کروں گا جو کہ اس درس کیلئے ایک اساس کی حیثیت رکھتی ہوں گی۔ اُس میں چند عنوانات بھی پیش کئے تھے۔ اب ان عنوانات کے تحت یہ مباحث ترتیب کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔ پہلا عنوان ہے:-

حصولِ علم کے ذرائع

قرآنِ حکیم کے نزدیک حصولِ علم کے ذرائع تین ہیں:-

الف۔ علم بالوحی ب۔ علم بالحواس ج۔ علم بالتّاریخ۔

اِس امر کے پیشِ نظر قرآنِ حکیم میں تین قسم کی ''آیات'' ہیں جن میں مشاہدہ اور غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔

ا۔ الف۔ قرآن کی آیات:-

قرآنِ حکیم کے نزول کی غرض و غایت یہ بتلائی گئی ہے کہ اِس کی آیات میں غور کیا جائے اور اصحاب عقل و بصیرت اُن سے مستقل نتائج اخذ کر کے نصیحت و عبرت حاصل کریں۔

کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَیۡکَ مُبٰرَکٌ لِّیَدَّبَّرُوۡۤا اٰیٰتِهٖ وَ لِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ. (ص ۳۸: ۲۹)

ترجمہ: ''اے رسول ﷺ! آپ کی طرف یہ بابرکت کتاب اس لئے نازل کی گئی ہے تا کہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر کریں اور اربابِ عقل و فراست صحیح نتائج اخذ کر کے نصیحت و عبرت حاصل کریں۔''

Marfat.com

دوسری جگہ اپنے بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ''وہ قرآن کی آیات کو اندھا اور بہرا بن کر قبول نہیں کرتے بلکہ عقل وفہم اور علم وبصیرت کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔''

وَالَّذِیْنَ اِذَاذُکِّرُوا بِآیَاتِ رَبِّھِمْ لَمْ یَخِرُّ وا عَلَیْھَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا۔ (فرقان ۲۵ : ۷۳)

ترجمہ: ''اور جب انہیں اللہ کی آیات کے ذریعے نصیحت کی جاتی ہے تو ان پر بہرے اور اندھے ہوکر نہیں گرتے۔''

ب۔ فطرت کی آیات

۱۔ اِنَّ فِیْ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔ (الجاثیہ ۴۵: ۴۶)

ترجمہ: ''بلاشبہ ارض وسماوات میں اہل ایمان کیلئے بہت سی نشانیاں ہیں۔''

۲۔ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔ (عنکبوت ۲۹ : ۴۴)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے ارض وسماوات کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ ایمان والوں کے لیے اس میں بڑی نشانی ہے۔''

۳۔ اَلَمْ یَرَوْ اِلَی الطَّیْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَاءِ مَا یُمْسِکُھُنَّ اِلَّا اللّٰہُ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔ (نحل ۲۶ : ۷۹)

ترجمہ: ''کیا پرندوں کو نہیں دیکھتے کہ آسمان کی فضا میں مطیع ومنقاد اُڑ رہے ہیں۔ اللہ کے سوا کون ہے جو انہیں تھامے ہوئے ہے بلاشبہ ایمان لانے والی قوم کیلئے اس آیت میں بڑی ہی نشانیاں ہیں۔''

ج۔ تاریخ کی آیات

قرآن حکیم میں کتنی سورتیں ایسی ہیں جن میں انبیاء اور ان کی اقوام کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک سورۃ شعراء بھی ہے۔ سورۃ شعراء میں کئی انبیاء اور ان کی اقوام کا ذکر ہے۔ ہر نبی اور اُس کی قوم کے ذکر کے بعد اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ کے الفاظ سات مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔

Marfat.com

پھر ایک مقام پر فرمایا کہ ہم انسان کو نفس انسانی کے اندر اور خارجی کائنات میں اپنی آیات دکھائیں گے حتی کہ اُن پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن حق ہے۔

سَنُرِيهِمْ آيٰتِنَا فِي لْاٰفَاقِ وَ فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ. (حم سجدہ ۴۱ : ۵۳)

ترجمہ: ''ہم عنقریب اُن کو اُن کی ذات کے اندر اور خارجی کائنات میں آیات دکھائیں گے یہاں تک کہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن حق ہے۔''

۲۔ عِلم بالوحی

کائنات کا نظام اللہ تعالیٰ نے اس طرح بنایا اور چلایا ہے کہ کائنات کو پیدا کر کے ہدایت کا سامان خود اُن کے اندر رکھ دیا ہے۔

رَبُّنَا الَّذِيْ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى. (طٰہٰ : ۲۰ : ۵۰)

ترجمہ: ''ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُس کی مناسب بناوٹ عطا فرمائی پھر اُس کی ہدایت و رہنمائی کا سامان کر دیا۔''

دوسری جگہ فرمایا:

اَلَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى. وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى. (اعلیٰ : ۲،۳)

ترجمہ: ''وہ پروردگار عالم جس نے پیدا کیا اور پھر اُسے ٹھیک ٹھیک درست کیا اور وہ پروردگار جس نے ہر وجود کا ایک اندازہ ٹھہرایا اور اسکی رہنمائی کی۔''

یہ ہدایت، یہ رہنمائی اپنے اپنے فریضہ کو ادا کرنے کا علم اور زندگی بسر کرنے کا طریقہ ہے۔ کائنات کو دیکھئے۔ اس میں ہر بے جان اور جاندار وجود اپنے فرض منصبی کو نہایت خوبی سے ادا کر رہا ہے۔ ہر مخلوق کی طبیعت کیلئے ایک اندرونی الہام اور داخلی وحی موجود ہے جو اُسے اپنے مقرر شدہ فریضہ کے مطابق چلا رہی ہے۔

---

[1] یہاں ہم نے ان آیاتِ جلیلہ کی تشریح بیان نہیں کی کیونکہ یہاں صرف ''آیات'' کے لفظ کا استعمال دکھانا مقصود ہے تشریح اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔

Marfat.com

وحی یا الہام اللہ تعالیٰ اور اُس کی مخلوق کے درمیان ایک پیغام یا ایسی تار برقی ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے خالق سے ہمراز یا ہم کلام ہوتی ہے۔ گو اس مخلوقات کو اس خالق سے کچھ بھی مماثلت نہیں مگر تاہم ایک ایسا رابطہ ہے کہ گویا وہ اس کے پاس ہر وقت موجود ہے۔ مولانا رومؒ نے فرمایا ہے:-

؎ اتصال بے تکیف بے قیاس ہست رب النّاس را با جانِ ناس

؎ سب سے ربط آشنائی ہے تجھے دِل میں ہر ایک کے رسائی ہے تجھے

اس امر میں اِنسان، حیوان، شجر و حجر، زمین و آسمان سب شریک ہیں۔ ہر دم وہاں سے ہر ایک چیز کی طرف تار برقی کا سلسلہ جاری ہے اور ہر نوع کی طرف اس کی وحی ہوتی ہے اور اسی لیے ہر نوع کی ایک شریعت جُدا ہے کہ اس پر اس کی مخالفت حرام کر دی گئی ہے۔ معدنیات کی طرف یہ الہام ہو رہا ہے کہ اپنی صلابت اور رخوت اور حرارت یا بُرودت کو محفوظ رکھے۔ ان کی صورتِ نوعیہ ہمیشہ ان اوامر الٰہی کے بجالانے میں کمربستہ اور دست بستہ کھڑی رہتی ہے کہ کبھی آگ سے حرارت دُور نہ ہونے پائے اور پانی سے رطوبت اور بُرودت نہ جائے، اور نباتات کی طرف ہر وقت یہ پیغام پہنچتے ہیں کہ وہ خاک کو پانی کے ذریعہ سے چوس کر شاخ و برگ و گل بنا دے اور اتنی مدت میں پھل آویں اور اتنی مُدت میں پھول آئیں، اور پتوں کی یہ رنگت اور صورت رہے۔ اس میں اس طرح کی لکیریں اور ایسے ریشے ہوں اور پھول پنکھڑیاں اور اتنی رنگت اور ایسی خوشبو رہے۔ ہر دم ان کی صورت نوعیہ اور فرائض کو ادا کئے چلی جاتی ہے۔ بیری کے پتے پر حرام ہے کہ وہ پیپل کے پتے کی صورت میں آئے اور آم کو حرام ہے کہ وہ بیر بن جائے۔ حیوانات پر یہی وحی آتی ہے اور یہ باتیں فرض ہیں کہ ہر نوع ہمیشہ اپنی صورت نوعیہ پر قائم رہے۔ پرندوں کو یہ الہام ہوا کہ نر و مادہ باہم اس طرح میل و جول کریں، گرمی کے موسم میں اپنا گھونسلا بنائیں، انڈوں کو اس طرح سیئیں، بچے اس طرح نکالیں، دانہ پانی وہاں سے لائیں، بچوں کو اس طرح کھلائیں، بڑے ہو

Marfat.com

کر اس طرح اُڑیں، دشمن سے بھاگیں، اپنے مقابل سے دُور رہیں۔ جب کہ وہ ان کی ضروریات میں مخل ہو تو اس سے جنگ کریں، اپنے بنی نوع کے ساتھ رہا کریں۔ اِسی طرح گائے، بھینس، انسان، گھوڑے، گدھے ہر ایک نوع کیلئے بذریعہ الہام اور وحی وہ علوم سکھائے جاتے ہیں کہ جو ان کے نوع کو کارآمد اور ضروری ہیں اور ان چیزوں سے ان کی صورت نوعیہ کو منع کیا جاتا ہے جو ان کے حق میں ضرر رساں اور خلل انداز ہیں۔ گائے بھینس پر حرام ہے کہ وہ گوشت کھائیں۔ اگر اس حرام کا ارتکاب کریں تو اس کی سزا ان کو وہیں ملے۔ شیر پر گھاس کھانی حرام ہے اور گوشت کھانا فرض ہے۔ اس حکم کو عدول کرے تو سخت مضرت اُٹھائے، نقصان کے جہنم میں جائے۔ شہد کی مکھیوں پر فرض کر دیا گیا ہے کہ درختوں کے پتے، پھل اور پھول دیکھ کر کھائیں۔ پھر اپنے بنی نوع کے لئے ایک گھر بنائیں اور وہاں شہد اس طرح سے بھریں اور اپنے سردار یعسوب کی اطاعت کریں۔ الغرض اور بہت سے حالات ہیں کہ جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں۔ الغرض اس وحی میں ہر ایک چیز شریک ہے اور ہر نوع کی شریعت جُداگانہ ہے اور ہر نوع اس شریعت کی مجبوراً پابند ہے۔ چنانچہ ان آیات میں اسی طرف اشارہ ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ. (النحل ١٦: ٤٩)

ترجمہ: ''اور زمین اور آسمان اللہ تعالیٰ کو سجدہ کر رہے ہیں۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ. ط وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ. لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ. (یٰسین ٣٦: ٣٨، ٣٩، ٤٠).

ترجمہ: ''اور سورج ہے کہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے یہ اندازہ ٹھہرایا ہوا ہے اُس زبردست اور باخبر ہستی کا، اور چاند (ہے کہ) اس کیلئے ہم نے منزلیں ٹھہرا دی ہیں۔ یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے ایسا ٹیڑھا اور پتلا و باریک رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی۔''

Marfat.com

اور علاوہ ان کے اور بہت سی آیات ہیں۔ قرآن مجید کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں ہر ایک قسم کی حکمت اور چیز کے سّر (راز) کی طرف اشارہ ہے۔ کلام الٰہی میں یہ خوبی ضرور ہونی چاہیئے اور انہیں وجوہ کی بنا پر اس کا مثل محالات سے ہے۔ مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اس وحی اور الہام میں ہر چیز شریک ہے اور ہر ایک اس کی اطاعت پر سر بہ سجود ہے اور یہی اطاعت ان کا ذکر اور یہی ان کی تسبیح و تقدیس کہ جس سے کوئی جزو خالی نہیں۔

بذکرش ہر چہ بینی در خروش است   دلے داند دریں معنٰی کہ گوش است

نہ بلبل برگلش تسبیح خوانے است   کہ ہر خارے بہ تسبیح اش زبانے است

ترجمہ: ''جس چیز کو بھی دیکھو، وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر جوش و خروش سے کر رہی ہے، اُسے معلوم ہے کہ اس کا ذکر سننے والا کان موجود ہے۔ صرف بلبل ہی پھولوں پر تسبیح خوانی نہیں کرتی بلکہ ہر کانٹا اُس کی تسبیح کیلئے زبان رکھتا ہے۔''

لیکن اس وحی اور الہام کی جُدا زبان ہے جس زبان سے ہر چیز اس سے بات کرتی ہے اور اپنے دردِ دل کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ اور زبان ہے۔ باغ میں سرو کا درخت دست بستہ کھڑا ہو کر جس زبان سے عرض حال کر رہا ہے وہ اور ہے، دریا اور پہاڑ اور ہیبت ناک جنگل بلکہ انسان کے ہر ہر عضو بلکہ عالم کا ہر جز جس زبان سے کلام کر رہا ہے وہ اور زبان ہے۔ یہ زبان کہ جس سے ہم بولتے ہیں اور زبان ہے۔ اس زبان میں بے آواز اور بے حروف اور بغیر الفاظ کے وحی آتی ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے۔

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ وَقَالَ اَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا. (مقدمہ حقائق)

ہر کرۂ سماوی کی طرف وحی یہ ہے کہ اپنے فرائض مفوّضہ کو سرانجام دے رہا ہے۔ بڑے بڑے ستارے اور شموس و اقمار عظیم الشان جسامت، وزن اور حجم کے ساتھ پیچ در پیچ راستوں پر سرِ مو انحراف نہ کرتے ہوئے انتہائی سُرعت رفتاری سے اپنے اپنے مقررہ

Marfat.com

راستوں اور محوروں پر چکر لگا رہے ہیں کہ ان کے حسابی اندازوں کو دیکھ کر زمانہ حاضرہ کے ماہرین افلاک دنگ رہ جاتے ہیں اور بے ساختہ پکار اُٹھتے ہیں کہ اللہ ایک بہت بڑا ریاضی دان ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ:۔

می زند اختر سُوئے منزل قدم   پیش آئینے سرِ تسلیم خم

ترجمہ: ''یعنی ہر ستارہ اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ آئین الٰہی کے سامنے سر جھکائے گویا وہ اپنے مقررہ راستہ یا مدار پر رواں ہے۔''

یہ وحی ہر مخلوق کی طرف براہ راست اور بلا واسطہ کی جاتی ہے۔ لیکن سطحِ انسانی پر آ کر وحی کے اس طریقہ میں تبدیلی آ گئی۔ اِنسان کو صاحبِ ارادہ و اختیار بنانے کیلئے یہ تبدیلی ناگزیر تھی۔ نسل انسانی کے ہر فرد کو اگر اشیائے کائنات اور دیگر حیوانات کی طرح براہ راست وحی کی جاتی تو انسان بھی اشیائے کائنات اور دیگر حیوانات کی طرح مجبور محض ہوتا اور ایسا ہونا اس کے ارتقاء میں مزاحم ہوتا۔ وہ حیوانی سطح سے آگے نہ جا سکتا، اس کا ارتقاء حیوانی سطح پر پہنچ کر رہ جاتا۔ اسلیئے وحی کا علم اس کی فطرت میں ودیعت نہیں کیا گیا۔ اُسے صاحبِ ارادہ و اختیار بنانے کیلئے مختلف طریقہ تجویز کیا گیا۔ اُس کی نوع میں سے ایک اہل اور مناسب فرد کو منتخب کیا گیا جسے خیر و شر اور محسوس و ماورائے محسوس حقائق کا علم بذریعہ وحی عطا کر کے حکم دیا کہ یہ علم نوعِ انسانی کو پہنچایا جائے۔ چنانچہ انبیائے کرام علیہم السلام نے وہ علم نوعِ انسانی کو پہنچایا۔ اِس طرح وحی کا علم نوعِ انسانی کو پہنچ گیا اور انسان صاحبِ ارادہ و اختیار بھی رہا تا کہ اُس کا ذہنی و نفسی ارتقاء کسی صورت رُکنے نہ پائے۔ اس طرح نوعِ انسانی کو کرّہ ارضی پر ایک منفرد اور امتیازی حیثیت حاصل ہو گئی۔ فرمایا:۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. (اعراف ۷: ۳۵)

Marfat.com

ترجمہ: ''اے اولادِ آدم! جب کبھی ایسا ہو کہ میرے پیغمبر تم میں پیدا ہوں اور میری آیتیں تمہیں پڑھ کر بتائیں تو جو کوئی تقویٰ اختیار کرے گا اور اصلاح کرے گا اُس کے لئے نہ کسی کا اندیشہ ہوگا اور نہ غم۔''

اِس وحی کی نوعیت یہ ہے کہ یہ داخلی (SUBJECTIVE) نہیں ہوتی بلکہ خارجی (OBJECTIVE) ہوتی ہے۔ انسان خود شعور ہوتے ہی خیر و شر کے علم کیلئے خارجی وحی کا محتاج ہوا اور آج بھی ہے۔

آدمی اندر جہانِ خیر و شر　　کم شناسد نفع را خود از ضرر
کس نداند زشت و خوبِ کار چیست　　جادۂ ہموار و ناہموار چیست

ترجمہ: ''خیر و شر پر مبنی دنیا میں انسان اپنے نفع و نقصان کو بہت کم سمجھتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کسی کام کا اچھا بُرا کیا ہے؟ اور کون سا راستہ ہموار ہے اور کون سا ناہموار ہے؟''

نوعِ انسانی کے اندر جس فرد کو وحی کا علم دیا جاتا ہے اُس کو نبی کہتے ہیں۔ نبی نباءَ سے بھی مشتق ہے اور نباوۃ سے بھی۔ نباءَ خبر اور علم کو کہتے ہیں اور نباوۃ رفعت و بلندی کو نبی کے لفظ کے اندر یہ دونوں مفہومات بہ یک وقت پائے جاتے ہیں۔ نبی خبر و علم، دینے والے کو بھی کہتے ہیں کیونکہ نباءَ تہ، انباءَ تہ کے معنی خبر دینے کے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں ہے:-

اَنۡبِئُوۡنِیۡ بِاَسۡمَآءِ ھٰۤؤُلَآءِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ. (البقرہ ۲ : ۳۱)

ترجمہ: ''اگر تم اپنے خیال میں درست ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ۔''

نَبِّئُوۡنِیۡ بِعِلۡمٍ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ. (انعام ۶ : ۱۴۳)

ترجمہ: ''اگر تم سچے ہو تو مجھے علم کے ساتھ اس کا جواب دو۔''

علم و خبر کے معنوں میں نبی فعیل بمعنی فاعل کے معنوں میں بھی ہو سکتا ہے کیونکہ نبی نوع انسان کو علم و خبر پہنچانے والا ہوتا ہے۔

نَبِّئۡ عِبَادِیۡ. (۱۵ : ۴۹)

Marfat.com

ترجمہ: ''اے پیغمبر! میرے بندوں کو یہ بات بتا دو۔''

اور نبی فیل بمعنی مفعول بھی ہو سکتا ہے یعنی علم وخبیر دیا گیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُسے علم وخبر ملتی ہے۔ جیسے فرمایا:-

نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ. (التحریم ٦٦: ٣)

ترجمہ: ''مجھے خدائے علیم وخبیر نے بتلایا ہے۔

نبی دونوں مفہومات کا حامل ہوتا ہے۔ اس لئے نبی اُسے کہتے ہیں جو علم کے بلند ترین مقام پر متمکن ہوا اور اُسے لوگوں تک پہنچائے۔ نبی کا ترجمہ انگریزی میں PROPHET کیا گیا ہے۔ یہ سُریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں پیشگوئی کرنے والا۔ یہ کہانت کے تصور کی وجہ سے ہے جو یہودیوں میں خاص طور پر پایا جاتا ہے۔ یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ نبی کاہن، جوتشی، نجومی یا جفار نہیں ہوگا۔ وہ علم کے بلند ترین مقام پر فائز ہوتا ہے۔ جن حقائق کے متعلق ہمارا ایمان بالغیب ہوتا ہے، نبی کا ایمان بالشہود ہوتا ہے۔ خدائے عالم الغیب والشہادۃ اُسے دنیائے محسوس اور غیر محسوس کا مشاہدہ کرا دیتا ہے۔[1] ایک عامی کی نگاہ میں جو چیزیں مخفی ہوتی ہیں، وہ ماہرِ فن کے مشاہدہ و تجربہ میں ہوتی ہیں۔ مریض دوائی کے تجزیہ و تجربہ کے بغیر بھی اُس کے پُر اثر ہونے پر ایمان بالغیب رکھتا ہوا اُسے استعمال کرتا ہے لیکن ماہرِ فن طبیب یا دواساز اُس کے اجزائے ترکیبی کی ماہیت اور کیفیت کا پورا علم رکھتا ہے۔

نبی کو جو علم دیا جاتا ہے وہ اُسے اپنے سینہ میں راز بنا کر نہیں رکھتا۔ اِن حقائق کو وہ لوگوں تک پہنچاتا ہے اور ان کی بنیادوں پر ایک نظام کو عملاً قائم کرنے کی سعی وجہد فوراً شروع کر دیتا ہے۔ ایک صالح تہذیب کی بنیاد ڈال کر ایک صالح تمدن وجود میں لاتا ہے۔ یہ اس کا فریضۂ رسالت ہے۔ اُس کو علم دے کر اُسے ''نبی'' اسی لئے بنایا جاتا ہے۔ نبوت اور رسالت دو علیحدہ علیحدہ اور جُدا جُدا چیزیں نہیں۔ نبوت اور رسالت لازم و

---

[1] اس کی تشریح سورہ فاتحہ کی تشریح میں آئے گی۔

Marfat.com

ملزوم ہیں۔ نبوت اُس کا منصب ہے جس پر وہ فائز ہے اور رسالت اُس کا فریضہ۔ اسلئے ہر نبی رسول ہوتا ہے اور ہر رسول نبی۔ صاحب کتاب ہونے کی بنیاد پر رسول اور نبی میں فرق کرنا ایک ایسا تصور ہے جس کی قرآن میں کہیں کوئی شہادت موجود نہیں بلکہ اس کے برعکس قرآن رسول اور نبی ہر دونوں کو صاحب کتاب کی حیثیت میں پیش کرتا ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ. (البقره ۲۱۳)

ترجمہ: ''ابتدا میں انسانوں کا ایک ہی گروہ تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ باہم دگر مختلف ہو گئے۔'' (یونس ۱۰:۱۹)
''تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو بھیجا جو ایمان و عمل کی برکتوں کی بشارت دیتے اور انکار و بدعملی کے نتائج سے متنبہ کرتے اور ان کے ساتھ آسمانی کتابیں بھی ٹھیک طور پر نازل فرمائیں۔'' (بقرہ:۲۱۳)

دوسری جگہ فرمایا:

قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَا اُنْزِلَ اِلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَا اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَا اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ. (بقرہ ۲:۱۳۶)

ترجمہ: ''مسلمانو! تم کہو ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں۔ قرآن پر ایمان لائے ہیں اور جو کچھ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور اولاد یعقوبؑ پر نازل ہوا اس پر ایمان لائے ہیں اور جو کچھ موسیٰؑ عیسیٰؑ اور دیگر انبیاء کو اپنے رب کی طرف سے دیا گیا اُس پر بھی ایمان لائے ہیں۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے متعلق فرمایا:۔

اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا. (مریم ۱۵:۳۰)

ترجمہ: ''اُس نے مجھ کو کتاب دی اور اُس نے مجھ کو نبی بنایا۔

اُوپر کے ہر سہ مقامات پر انبیاء کی طرف نزولِ کتاب کا ذکر فرمایا۔ اسی طرح رسولوں کی طرف بھی نزولِ کتاب کا ذکر فرمایا:۔

Marfat.com

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ. (حدید ۵۷:۲۵)

ترجمہ: ''ہم نے اپنے رسولوں کو واضح احکام دے کر بھیجا اور ہم نے اُن کے ساتھ کتاب نازل کی۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے متعلق فرمایا:۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا. (مریم ۱۹:۵۴)

ترجمہ: ''اور اس کتاب میں اسمٰعیلؑ کا بھی ذکر کیجئے۔ بلاشبہ وہ وعدے کے بڑے سچے تھے۔ وہ رسول بھی تھے اور نبی بھی۔''

حضرت خاتم النبیّن کے متعلق رسول اور نبی دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ. (الفتح ۴۸:۲۹)

ترجمہ: ''محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔''

لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ. (الحجرات ۴۹:۲)

ترجمہ: ''تم اپنی آوزیں نبی ﷺ کی آواز سے مت بلند کرو۔''

نبوت حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوئی اور حضرت محمد ﷺ پر ختم ہوئی۔ ختم نبوت کا علم قرآن حکیم میں محفوظ کر دیا اور فریضہ رسالت کو اُمت کی طرف منتقل کر دیا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا. (بقرہ ۲:۱۴۳)

ترجمہ: ''اور اسی طرح تم کو ہم نے ''اُمت وسط'' بنایا اور رسول کا قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو دنیا کے لوگوں پر شہید فرمایا اور تمہارے لیے رسول کو اپنے ذمہ دار نمائندے کی حیثیت سے شہید بنایا۔'' (یہاں شہادت کے معنی ادائے فریضۂ دعوت دین کے ہیں)

ختم نبوت نہ صرف اعتقادی اور مابعد طبیعاتی اعتبار سے بلکہ علمی، تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی حیثیت سے بھی اہم اور دور رس نتائج کی حامل ہے۔ اس موضوع پر نہایت جامع اور مبسوط بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں پر صرف علامہ اقبالؒ کے خطبات

Marfat.com

میں سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:-

''اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبر اسلام ﷺ کی ذاتِ گرامی کی حیثیت دُنیائے قدیم اور دنیائے جدید (جس کا ظہور آپ کی تعلیمات کے بدولت ہوا) کے درمیان ایک واسطہ کی ہے۔ بہ اعتبار اپنے سرچشمۂ وحی کے، آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے۔ یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم وحکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رُخ کے عین مطابق تھے۔ لہذا اسلام کا ظہور استقرائی علم کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت چونکہ معراج کمال کو پہنچ گئی، اس تکمیل سے اُس نے خود اپنی خاتمیت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ لہذا اُس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا کہ زندگی کو ہمیشہ کیلئے عہد طفولیت کی حالت میں سہاروں پر نہیں رکھا جا سکتا۔ انسان میں خود شعوری کی تکمیل ہوگی تو یوں ہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے (جیسا کہ تعلیمات قرآنی کا مقصود بھی یہی ہے) یہ وجہ ہے کہ اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا، یا موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا، یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا، یا عالمِ فطرت اور عالمِ تاریخ کو علمِ انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لئے کہ ان سب کے اندر ہی نکتہ مضمر ہے............ وارداتِ باطن [1] کی بھی اگر کوئی شکل ہو، ہمیں بہر حال حق پہنچتا ہے کہ عقل اور فکر سے کام لیتے ہوئے اس پر آزادی کے ساتھ تنقید کریں، اس لئے کہ اگر ہم نے ختم نبوت کو مان لیا تو گویا یہ عقیدہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعویٰ کا حق نہیں کہ اُس کے علم کا تعلق چونکہ کسی مافوق الفطرت سرچشمے سے ہے لہذا

---

[1] علم کا ایک اور ذریعہ جو حواس سے بے تعلق ہے اور جس کو بالعموم وجدان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ علم صوفیانہ واردات کا ہے۔ اس کی نوعیت استدلالی نہیں بلکہ حضوری ہوتی ہے۔ لیکن انبیائے کرام کے مشاہدات اور صوفیانہ واردات میں بہت فرق ہے۔ انبیائے کرام کے مشاہدات میں ان کے ذاتی رجحانات اور میلانات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ لیکن صوفیانہ واردات میں یہ بات نہیں ہوتی۔ یہ ذاتی رجحانات، میلانات، ماحول اور اکتسابی علم سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ ایک نبی کے مشاہدات دوسرے نبی کے مشاہدات کی لازماً تائید وتصدیق کرتے ہیں لیکن صوفیاء کے واردات میں یہ بات ضروری نہیں۔ ایک صوفی کے رُوحانی واردات کے نتائج دوسرے صوفی کے رُوحانی واردات کے نتائج سے بالکل مختلف بلکہ متضاد اور متناقض بھی ہو سکتے ہیں۔ شعور ولایت کسی کیلئے حجت نہیں بلکہ خود صاحب واردات کیلئے بھی حجت نہیں بن سکتا، اور نہ شعور ولایت تنقید سے بالاتر ہے۔ جیسا کہ علامہ موصوف نے یہاں واضح کر دیا ہے۔ باعتبار علم صرف شعور نبوت کو حجت ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

ہمیں اُس کی اطاعت لازم آتی ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو خاتمیت کا تصور ایک طرح کی نفسیاتی قوت ہے جس سے اس قسم کے دعووں کا قلع قمع ہو جاتا ہے کہ انسان کی باطنی واردات اور احوال کی دنیا میں بھی علم کے نئے نئے دروازے کھل جائیں (اور ہم ان کا مطالعہ عقل وفکر اور تعلیمات نبوت کی روشنی میں کریں.............. لہذا مسلمانوں کو چاہیئے کہ صوفیانہ واردات کو خواہ ان کی حیثیت کیسی بھی غیر معمولی اور غیر طبعی کیوں نہ ہو، ایسا ہی فطری اور طبعی سمجھیں جیسے اپنی دوسری واردات اور اُس کیلئے ان کا مطالعہ بھی تنقید و تحقیق کی نگاہوں سے کریں۔"

۳۔ علم بالحواس:

اب ہم حصول علم کے دوسرے ذریعے کی طرف آتے ہیں یعنی علم بالحواس، قرآن عالم فطرت کو انسانی علم کا سرچشمہ قرار دیتا ہے۔ قرآن کا ظہور عقل استقرائی کا ظہور ہے۔ سائنس اپنی ہستی اور وجود کیلئے قرآن کی مرہون منت ہے۔ [1] نزولِ قرآن سے پہلے اور نزولِ قرآن کے بعد سائنسی ترقی کا مقابلہ کیا جائے تو اس اعتبار سے نزولِ قرآن سے پہلے زمانہ کو اگر "عہد قبل از سائنس" (PRE-SCIENTIFIC AGE) کہیں تو یہ ایک حقیقت کا اظہار ہوگا۔ یورپ میں سائنس کا ظہور تحقیق و تفتیش کی جس نئی روح کی بدولت ہوا وہ نئے طریقہ ہائے تحقیق منہاجِ تجربی (INDUCTIVE METHOD) اور دوسرے نئے منہاجات (METHODS) کے نشو ونما کا نتیجہ تھے۔ یہ منہاجات یورپ میں عربوں کے ذریعے پھیلے جنھوں نے قرآنِ حکیم سے حاصل کئے تھے۔ سورۃ بنی اسرائیل کی ایک آیت میں علم کی نہایت حکیمانہ تعریف کی گئی ہے فرمایا:۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ط اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْدً. (بنی اسرائیل ۷: ۳۶)

---

[1] دیکھئے MAKING OF HUMANITY BY BRIF FAULT

Marfat.com

ترجمہ: ''اور جس بات کا تم کو علم نہیں اُس کے پیچھے نہ ہولیا کرو۔ کیونکہ کان، آنکھ اور ذہن سب سے اِس امر کی پُرسش ہوگی۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ''علم'' وہ شے ہے جو براہ راست سمع، بصر اور ذہن سے حاصل ہو۔ فؤاد اور قلب سے مُراد قوت مُدرکہ ہے جس سے سب تعقل ہوتا ہے۔ جو اس کی اطلاع ذہن (فؤاد) کو ملتی ہے جو کہ نتائج استنباط کرتا ہے۔ ''علم'' کی اس تعریف کو قرآن نے ربانی حکمت کا جزو قرار دیا ہے۔

ذٰلِکَ مِمَّا اَوۡحٰی اِلَیۡکَ رَبُّکَ مِنَ الۡحِکۡمَۃِ. (بنی اسرائیل ۷: ۳۹)

ترجمہ: ''یہ احکام ہیں جو تمھارے پروردگار نے اپنی حکمت کاملہ سے تم پروحی کردیئے ہیں۔''

''علم'' کی اس تعریف کی رُو سے صَرف ونحو، بلاغت، عروض وغیرہ ''علوم'' نہیں بلکہ یہ زبان دانی اور ادب کی چیزیں ہیں۔

پانی کو اگر ہم مَاءٗ آب یا واٹر کہنا سیکھ لیں تو ہمارے ''علم'' میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر ہمیں از روئے تجربہ یہ معلوم ہو جائے کہ پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن گیسوں کے دو اور ایک کی نسبت (H_2O) کا مرکب ہے تو یہ علم ہے۔ علامہ اقبالؒ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

''علم سے میری مُراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیئے۔ اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو شیطنت ہے۔ یہ علم علم حق کی ابتدا ہے جیسا کہ میں نے جاوید نامے میں لکھا ہے:۔

علم حق اوّل حواس آخر حضور　　آخرِ او مے نہ گنجد در شعور

وہ علم جو شعور میں نہیں سما سکتا علم حق کی آخری منزل ہے اس کا دوسرا نام عشق ہے۔ علم و عشق کے تعلق میں جاوید نامے میں کئی اشعار ہیں۔

Marfat.com

علم بے عشق است از طاغوتیاں   علم با عشق است از لاہوتیاں

ترجمہ: "عشق ومحبت کے بغیر علم کی حیثیت ایسی ہے گویا وہ اہل طاغوت کا علم ہے اور اگر اس میں عشق بھی شامل ہے تو پھر اسی علم کو اہل لاہوت کے علم کی حیثیت حاصل ہوگی۔"

مسلمان کیلئے لازم ہے کہ علم کو (یعنی اس علم کو جس کا دارومدار حواس پر ہے اور جس سے بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے مسلمان کرے۔ "بولہب راحیدرِ کرار کن" اگر یہ بولہب حیدر کرار بن جائے یا یوں کہیے اگر اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسانی کیلئے سراسر رحمت ہے۔"

۴۔ علم بالتّاریخ

قرآن جس طرح علم فطرت کو علم کا سرچشمہ قرار دیتا ہے اسی طرح عالم تاریخ کو بھی علم کا سرچشمہ قرار دیتا ہے۔

مذاہب کا عالمگیر اعتقاد یہ ہے کہ جزاوسزا محض اللہ کی خوشنودی اور اُس کے قہر و غضب کا نتیجہ ہے۔ اعمال کے نتائج کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ اُلوہیّت و شاہیّت کا تشابہؔ تمام مذہبی تصورات کی طرح اس معاملہ میں بھی گمراہیٔ فکر کا موجب ہوا تھا۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ ایک مطلق العنان بادشاہ کبھی خوش ہو کر انعام واکرام دینے لگتا ہے اور کبھی بگڑ کر سزائیں دینے لگتا ہے۔ اس لئے خیال کرتے تھے کو اللہ تعالیٰ کا بھی یہی حال ہے۔

قصصِ انبیاء اور اقوام قرآن پاک کی مختلف سورتوں کا موضوع ہے۔ **استقراء** علمی کی طرح تاریخی کو **استقراء** تاریخ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ استقراء تاریخی کا مطلب یہ ہے قوموں کی جو تاریخ پیش کی گئی اگر کوئی قوم جسمانی یا سیاسی حیثیت سے ہلاک ہوئی ہے تو اس معلول کی ایک حقیقی علت ہے۔ اِس علت سے معلول کا پیدا ہونا اِسی طرح یقینی امر ہے جس طرح کہ ایک خاص مقدار میں زہر کے کھانے سے آدمی کا مر جانا۔ قرآن یہی یقین نوع انسانی میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ چند

Marfat.com

تاریخی مثالیں فراہم کر کے کلیہ مرتب کرتا ہے کہ اقوام کے عروج و زوال کا باعث اُن کے اعمال ہیں۔ کائناتِ ہستی کے ہر گوشہ کی طرح قوموں اور جماعتوں کے لئے اللہ کا قانونِ جزا و سزا یا قانونِ مکافات ایک ہی ہے جو کچھ ماضی میں پیش آ چکا ہے، ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةَ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا. (الاحزاب ۳۳:۶۲)

ترجمہ: ''جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں اُن کے اللہ کی سنت یہی رہی ہے اور اللہ کی سنت یعنی قانون میں تم کبھی ردو بدل نہیں پاؤ گے۔''

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّةَ الْاَوَّلِيْنَ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتَ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا. (فاطر ۳۵:۴۳)

ترجمہ: ''پھر یہ لوگ کس بات کی راہ تک رہے ہیں؟ کیا اُس سنت (قانون) کی جو اگلے لوگوں کیلئے رہ چکی ہے؟ تو یاد رکھو، تم اللہ کی سنت کو کبھی بدلتا نہیں پاؤ گے اور نہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ اُس کی سنت کے احکام پھیر دیئے جائیں۔''

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدَ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۷۷)

ترجمہ: ''اے پیغمبر! تم سے پہلے جن رسولوں کو ہم نے بھیجا ان کیلئے ہماری سنت یہی رہی ہے اور ہماری سنت کبھی ٹلنے والی نہیں۔''

تاریخ کے واقعات محض بخت و اتفاق کے تحت عمل میں نہیں آتے۔ قرآن عالمِ فطرت اور عالمِ تاریخ دونوں کو مستقل قوانین کے تابع قرار دیتا ہے۔ جس چیز کو قرآن مشیتِ الٰہی قرار دیتا ہے، وہ درحقیقت قوانین فطرت اور قوانین تاریخ کا عمل ہے، قرآن عملِ تاریخ کو قانونِ مکافات کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهِ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ. (انفال ۸:۵۳)

Marfat.com

ترجمہ: ''اللہ کسی نعمت کو جو اُس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اُس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرزِ عمل کو نہیں بدل دیتی۔''

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ. (الرعد ۱۳:۱۱)

ترجمہ: ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔''

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ. (توبہ ۹:۱۲۰)

ترجمہ: ''یقیناً اللہ تعالیٰ محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتے۔''

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ. (اعراف ۷:۹۶)

ترجمہ: ''اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے، مگر انہوں نے تو جھٹلایا، لہٰذا ہم نے اُس بُری کمائی کے حساب میں انہیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے۔''

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. (ال بقرة ۲:۱۴۱)

ترجمہ: ''یہ ایک امت تھی جو گزر چکی، اس کے لئے وہ تھا جو اس نے اپنے عمل سے کمایا۔ تمہارے لئے وہ ہوگا، جو تم اپنے اعمال سے کماؤ گے۔ تم سے کچھ اس کی پوچھ گچھ نہیں ہوگی کہ ان کے اعمال کیسے تھے؟''

انعام یافتہ جماعتوں کی سعادت و کامرانی اُن کے اعمال کا انعام تھے اور مغضوب و گمراہ جماعتوں کی شقاوت و محرومی اُن کی بدعملیوں کی پاداش تھیں۔ جن اسباب و علل سے دس مرتبہ ایک خاص طرح کا معلول (نتیجہ) پیدا ہو چکا ہو تم کیوں کر انکار کر سکتے ہو کہ گیارھویں مرتبہ ویسا ہی معلول پیدا نہیں ہوگا۔ [1]

---

[1] ترجمان القرآن جلد اوّل

Marfat.com

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ. (ال عمران ۳:۱۳۸)

ترجمہ: ''تم سے پہلے بھی دنیا میں اللہ کے احکام وقوانین کے نتائج گزر چکے ہیں پس ملکوں کی سیر کرو اور دیکھو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا؟ جنہوں نے اللہ کے احکام وقوانین کو جھٹلایا تھا''

۵۔ عقل وخرد

عقل کی حیثیت نہ صرف مشرق میں بلکہ مغرب میں بھی عجیب وغریب رہی ہے۔ ایک وقت تھا کہ یورپ میں عقل کو بُت بنا دیا گیا تھا۔ لیکن پھر اس بُت کو خود اپنے ہاتھوں سے پاش پاش کر دیا اور اس کے متعلق یہ رائے قائم کی گئی کہ:۔

''عقل درحقیقت ہماری خواہشات کی لونڈی ہے۔ اُس کا کام یہ ہے کہ ہم جن مقاصد کو لاشعوری طور پر حاصل کرنے کی خواہش کریں اُن کے حصول کیلئے ذرائع بہم پہنچادے اور جو کچھ ہم کرنا چاہیں اُس کے جواز کیلئے دلائل تلاش کر دے۔'' [۱]

''گذشتہ کچھ عرصہ سے عقل کچھ ایسی راندۂ درگاہ ہوئی ہے کہ اب اسے چند فریب خوردہ ماوراءِ طبعی لوگوں کی متروک توہم پرستی خیال کیا جاتا ہے'' [۲]

قرآن عقل کو ایک متعین مقام عطا کرتا ہے۔ گذشتہ نشست میں علم کی قرآنی تعریف آپ کو بتلائی تھی کہ جو سمع، بصر اور ذہن سے حاصل ہو۔ قرآن اس تعریف کو ربانی حکمت کا جز قرار دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان کیلئے حقیقت شناسی کی راہ یہی ہے کہ اللہ کی دی ہوئی عقل وبصیرت سے کام لے۔ قرآن کی کوئی سورت اور سورت کا کوئی حصہ ایسا نہیں جو تفکر وتعقل کی دعوت سے خالی ہو۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ. (الذریت ۲۰: ۲۱)

۲۔ JOAD: GUIDE TO MODERN THOUGHT

۳۔ ALFRED COBEN: THE CRISES OF CIVILISATION

Marfat.com

ترجمہ: ''اور یقین کرنے والوں کیلئے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمھاری ذات میں بھی اور کیا تم کو دکھائی نہیں دیتا؟''

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْ اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ. (یوسف ۱۲:۱۰۸)

ترجمہ: ''میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے پیروکار بھی۔''

جو عقل و فکر سے کام نہ لیتے ہوں قرآن پاک نے اُن کو بدترین حیوان کہا ہے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ. (انفال ۸:۲۲)

ترجمہ: ''یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔''

جو سمع، بصر اور ذہن سے کام نہ لیں وہ اصحاب جہنم ہوں گے۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ. (اعراف ۷:۱۷۹)

ترجمہ: ''اور ہم نے ایسے بہت سے جن و انس دوزخ کیلئے پیدا کیے ہیں (یعنی بالآخر اُن کا ٹھکانہ جہنم ہونے والا ہے، اُن کے پاس عقل ہے مگر اس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں، مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے کان ہیں، مگر اُن سے سننے کا کام نہیں لیتے وہ عقل و حواس کا استعمال کھو کر چارپایوں کی طرح ہو گئے ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔''

اور خود اس جُرم کا اعتراف کریں گے کہ:-

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ. (الملک ۶۷:۱۰)

ترجمہ: ''اگر ہم سنتے اور عقل سے کام لیتے تو ہم اہل دوزخ میں شامل نہ ہوتے۔''

قرآن مشرکین سے کہتا ہے کہ تم اپنے دعوے کی صداقت کی دلیل میں علم کو پیش کرو۔

Marfat.com

هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا. (الانعام ۶:۱۴۸)

ترجمہ: ''کیا تمھارے پاس علم کی کوئی چیز ہے۔ تو ہمارے رُوبرو ظاہر کرو۔''

۶۔ عقل اور وحی

وحی اور عقل کا علیحدہ علیحدہ ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اب ہم نے دونوں کا تعلق ظاہر کرنا ہے۔ درحقیقت وحی اور عقل کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ وحی اور عقل زندگی کی دو اساسی قدریں ہیں اور دونوں کا نصب العین ایک ہی ہے یعنی حقیقت کا اِدراک۔ لیکن ان دونوں کا حقیقت تک پہنچنے کا طریقہ مختلف ہے۔ وحی سے حقیقت کا علم بلا قید زمانہ طُرفتہ العین (یعنی پلک جھپکنے) میں ہو جاتا ہے۔ لیکن عقل کا طریقہ ''تجربہ وخطا'' کا طریقہ (METHOD OF TRIALS & ERRORS) ہے۔ عقل حقیقت کی جستجو میں نکلتی ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ غلط مقام پر پہنچ گئی۔ پھر دوبارہ نئے سرے سے جستجو کرتی ہے لیکن پھر غلطی کر جاتی ہے۔ اسی طرح اپنی جستجو کو جاری رکھتی ہے۔ کئی مرتبہ غلطیاں کر کے بالآخر حقیقت کا سراغ پانے کا طریقہ معلوم کر لیتی ہے لیکن پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا کہ یہ منزل صحیح ہے یا غلط۔

ہر دو امیرِ کارواں، ہر دو بہ منزلے رواں　　عقل بہ حیلہ مے برد، عشق برد کشاں کشاں
عشق زپا درآورد خیمۂ شش جہات را　　دست دراز مے کند تا بہ طناب کہکشاں

ترجمہ: ''عقل اور وحی دونوں اپنے اپنے شعبوں کے امیر و امام ہیں اور دونوں اپنی اپنی منزلوں کی طرف رواں دواں ہیں، عقل یہ کام حیلوں سے کرتی ہے لیکن عشق ایک ہی جست میں منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ عشق خیمۂ شش جہات کے پاؤں اکھیڑ دیتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ کہکشاں کی طناب (رسی) کو بھی ہاتھ دراز کر کے پکڑ لیتا ہے۔'' (ترجمہ: سعید بدر)

اسی حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے ''خطباتِ تشکیل جدید'' میں یوں پیش کیا ہے۔

Marfat.com

"عقل کو کسی حقیقت تک پہنچنے کیلئے خون کے دریا عبور کرنے پڑتے ہیں۔ آگ کی خندقوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ عقل بعد از خرابی بسیار کسی حقیقت تک پہنچتی ہے۔ اگر ابتدا ہی سے وحی کے متعین کردہ نصب العین کو اپنا لے تو اس قدر توانائی صرف نہ ہو۔ وحی ہماری توانائیوں میں کفایت پیدا کرتی ہے۔"[1]

؎ عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام............

It economizes our efforts

"جو شخص وحی کی خاطر جگہ بنانے کیلئے عقل و بصیرت کو خارج کر دیتا ہے وہ وحی اور عقل دونوں کے چراغ گل کر دیتا ہے۔"[2]

صرف یہی نہیں بلکہ وحی عقل کی حدود کو وسعت بخشتی اور نتائج کو ہمہ گیر اور دُور رس بناتی ہے۔ جس طرح آنکھ خاص دائرے کے اندر مرئی اشیاء کو دیکھ سکتی ہے لیکن اپنے دائرے سے باہر دُوربین اور اپنے دائرے کے اندر غیر مرئی اشیاء کیلئے خوردبین کی محتاج ہے۔ اسی طرح عقل بھی اپنے حدود میں وسعت اور نتائج میں ہمہ گیری پیدا کرنے کیلئے وحی کی محتاج ہے۔ لیکن جس طرح آنکھ کے بغیر دُوربین اور خوردبین بیکار ہیں اسی طرح عقل کے بغیر وحی افادیت اور مقصدیت سے خالی ہے۔ مشہور فلاسفر لاک نے بالکل صحیح کہا ہے:

انسانیت کے ہمہ جہتی ارتقاء کیلئے وحی اور عقل دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اِن دونوں میں سے کسی ایک کو ترک کر کے دوسری کو اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ وحی اور عقل ایک دوسرے کی متمم ہیں لہٰذا ایک دوسرے کی حلیف اور ہمدم و معاون۔ دونوں کا سرچشمہ ایک ہے اور دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کا سبب بنتے ہیں۔ [3]

علامہ اقبالؒ نے پیام مشرق میں اپنی ایک نظم بعنوان محاورہ "علم و عشق" میں [3] اس حقیقت کو پیش کیا ہے۔ قارئین کی بصیرت افروزی کیلئے یہ نظم مع ترجمہ پیش کی جاتی ہے۔

---

[1] اقبالؒ خطبات تشکیل جدید [2] Lock: ESSAY BOOK [3] عشق سے مُراد وحی ہے۔

Marfat.com

علم

نگاہم رازدار ہفت وچار است   گرفتار کمندم روز گار است
جہاں بینم بایں سُو باز کروند   مرابا آں سوئے گردوں چہ کار است
چکد صد نغمہ از سازے کہ دارمِ
بیا راز افگنم رازے کہ دارم

عشق

زافسونِ تو دریا شعلہ زار است   ہوا آتش گزار و زہر دار است
چو بامن یار بودی نور بودی   بُریدی از من و نورِ تو نار است
بخلوت خانۂ لاہوت زادی
و لیکن درنخ شیطان فتادی
بیا ایں خاکداں را گلستان ساز   جہاں پیر را دیگر جواں ساز
بیا یک ذرہ از دردِ دلم گیر   تہ گردوں بہشت جاوداں ساز
ز روزِ آفرینش ہمدم استیم
ہماں یک نغمہ راز زیر و بم استیم

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے اس نظم کا ترجمہ اور اس کی وضاحت کی ہے:۔

"علم دعویٰ کرتا ہے کہ میں ہفت افلاک اور چار عناصر یعنی خاک و افلاک کے رموز سے واقف ہوں اور تمام زمانے کے احوال و حوادث میرے احاطہ ادراک میں ہیں۔ مجھے بصیرت جہاں بینی کیلئے عطا ہوئی تھی سو اس جہان کو سمجھنے کا کام میں نے بخوبی سرانجام دیا۔ ستاروں سے آگے اگر کوئی جہان ہیں یا اگر کوئی لا زمانی و لا مکانی عوام کہیں ہیں تو مجھے اُن سے کیا واسطہ؟ میں اسرار کو سربستہ رکھنے کا قائل نہیں، جو کچھ معلوم ہوتا ہے تمام ماننے والوں کے سامنے علیٰ رؤس الاشہاد ببانگ کوس اس کا اعلان کر دیتا ہوں۔ عشق اس کے جواب میں کہتا ہے کہ آپ کی ساحرانہ قدرت کے تو ہم قائل ہیں مگر آپ نے ہم سے قطع تعلق کر کے دُنیا کو نمونہ جہنم بنا دیا ہے۔ دریاؤں

Marfat.com

میں بھی آگ لگائی ہے اور ہواؤں میں کہیں زہر پھیلا ہے اور کہیں آتش فشاں مادوں سے فضا کو شعلہ زار کیا ہے۔ جب تک ہم سے یاری قائم تھی تو تو نور تھا، ہم سے الگ ہو کر نار بن گیا۔ میری طرح تو بھی لاہوت کے خلوت کدے میں پیدا ہوا تھا لیکن بدقسمتی سے شیطان کی لپیٹ میں آ گیا۔ تلبس ابلیس نے تجھے بھی شیطنت سکھا دی۔ اب بھی اگر تو باز آ جائے تو پھر ہم اور تم بگڑی کو بنا سکتے ہیں۔ تو محض اپنی قدرت سے دُنیا کو جنت بنانے کے وہم باطل میں مُبتلا ہو گیا تھا۔ اب تو نے تجربہ کر لیا ہے کہ بے اعانت عشق، خالی علم سے جنت کی بجائے دوزخ وجود میں آتی ہے۔ ابتدائے آفرنیش میں اللہ نے ہم دونوں کو ہمدم اور ایک دوسرے کا معاون بنایا تھا۔ اب بھی باہمی تعاون سے ہم اس خاکداں کو جنت بنا سکتے ہیں اور اس فرسودہ جہان میں حیاتِ نو پیدا کر سکتے ہیں۔ علم سے محبت کچھ اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتا، تھوڑا سا دردِ دل مجھ سے لے کر پھر عمل کر اور دیکھ کہ اس گردوں کے نیچے بھی بہشت جاوداں کا لُطف پیدا ہو جائے گا۔ زندگی میں دو عظیم قوتیں ہیں۔ ایک علم اور دوسرا عشق، اللہ نے ان کو توام پیدا کیا ہے اور ان کا رابطہ اس قسم کا ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر بے کار بلکہ ضرر رساں ہو جاتا ہے۔"

از روئے عقل اور بواسطہ ایمان و وجدان اقبال موحدّ ہے اور اللہ تعالیٰ اور عالمِ رُوحانی کا قائل ہے۔ مذہب کی تلقین، اپنے وجدان اور حقائق حیات پر غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ زندگی میں دو ہی اقدار اساسی ہیں، ایک علم اور دوسرا عشق اور انسانی زندگی کے ہمہ سمتی ارتقاء کا مدار انہیں اقدار کے تحقق پر ہے۔

مغرب نے عقل کی رہنمائی کو تسلیم کیا اور وحی سے تعلق قطع کر دیا۔ مشرق نے وحی کے الفاظ کو لے لیا لیکن عقل کو اپنی زندگی سے بیدخل کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب اور مشرق دونوں کا ارتقاء یک رُخا ہو رہا ہے۔ انسانیت کا ہمہ جہتی ارتقاء عقل اور وحی کی آمیزش و امتزاج سے ہوتا ہے۔

غربیاں راز یرکی سازِ حیات　　　شرقیاں را عشق رازِ کائنات
عشق چوں بازیرکی ہم بر شود　　　نقشبندِ عالمِ دیگر شود

Marfat.com

خیز! نقش عالمِ دیگر بنہ
عشق را با زِیرکی آمیز دہ

ترجمہ: ''اہل مغرب کیلئے عقل ہی سازِ حیات ہے اور اہل مشرق کے نزدیک عشق کی بدولت رازِ کائنات کھلتے ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ جب عقل اور عشق دونوں ملتے ہیں تو ایک نئے جہاں کی تعمیر کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اُٹھ! اور نئے جہان کی تعمیر کا آغاز کر! (اور اس کیلئے) عشق اور عقل وخرد کی باہم آمیزش اور ملاپ ضروری ہے۔''

وحی اور عقل جب آپس میں مل جائیں تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کے جستجو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے علم الاسما
مقامِ فکر ہے پیمائشِ زمان و مکان
مقامِ ذکر ہے سُبحان ربی الاعلیٰ

قرآن حکیم میں اُولوالباب (اصحاب عقل وبصیرت) کی تعریف بیان کی گئی ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰماً وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ. (آل عمران ۳: ۱۹۰، ۱۹۲)

ترجمہ: ''بلاشبہ آسمان اور زمین کی خلقت میں اور رات دن ایک کے بعد ایک آتے رہتے ہیں، ارباب دانش کے لئے معرفت حق کی بڑی ہی نشانیاں ہیں۔ وہ ارباب دانش جو کسی حال میں بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے کھڑے ہوں، بیٹھے ہوں، لیٹے ہوں، ہر حال میں اللہ کی یاد اُن کے اندر بسی ہوتی ہے جن کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ آسمان وزمین کی خلقت پر غور وفکر کرتے ہیں۔ اِس ذکر وفکر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن پر معرفت حقیقت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ وہ پکار اُٹھتے ہیں خدایا! یہ جو کچھ تو نے پیدا کیا ہے سو بلاشبہ بیکار وعبث نہیں پیدا کیا۔ ضروری ہے کہ یہ کارخانہ ہستی جو اس حکمت وخوبی کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ کوئی نہ کوئی مقصود وغایت رکھتا ہو۔ یقیناً تیری ذات اِس سے پاک ہے کہ ایک بیکار کام اس سے صادر ہو۔ خدایا! ہم کو عذاب آتش سے بچا لیجیو!''

Marfat.com

اس نقطۂ نظر سے پولوسیت ۱؎ کے پیدا کردہ مذہب و سائنس کی معرکہ آرائی خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ سائنس حقیقت کا جزء جزء مطالعہ کرتی ہے اور دین حقیقت کا من حیث الکل مطالعہ کرتا ہے، حقیقت کو تماماً و کمالاً دیکھتا ہے۔ دین کے ''کل'' کے اندر سائنس کا جُز خود بخود شامل ہے۔

''لہٰذا دین کیلئے حقیقت کے جزئی علم (یعنی سائنس) سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں'' ۲؎ فلسفہ ہی حقیقت کا من حیث الکل مطالعہ کرتا ہے لیکن وہ محض فکر ہوتا ہے اور دین جو حقیقت کا من حیث الکل مطالعہ کرتا ہے۔

''نہ محض فکر ہے، نہ محض احساس، نہ محض عمل بلکہ انسان کی ذات کا کلی مظہر ۲؎ (EXPRESSION OF WHOLE LIFE) ہے۔ ۳؎

۱؎ موجودہ مسیحیت (Christianity) حضرت مسیح علیہ السلام کا پیش کردہ دین نہیں۔ اُن کا پیش کردہ دین تو اسلام ہی تھا۔ لیکن بعد میں جیسا کہ سب انبیاء کے متبعین کرتے چلے آئے ہیں۔ اُس دین کی صورت کو مسخ کر دیا گیا۔ در پولس (St Paul) نے جس دین کو تدوین کیا وہ آجکل کی مسیحیت ہے۔ اس لئے پولوسیت سے ہماری مراد موجودہ مسیحی مذہب ہے۔ ۲؎ خطبات ۳؎ راغب

Marfat.com

قرآن کے لفظ کا مفہوم اور اُس کی اہمیت

''قرآن'' لفظ قَرَاءَ سے مشتق ہے۔ اہل لُغت کے نزدیک اس کے بنیادی معنی جمع کرنے کے ہیں۔ زمانہ طہر میں جب خون رحم میں جمع ہوجاتا ہے تو اُسے قُرْءٌ کہتے ہیں جس کی جمع قُرُوْءٌ (البقرہ۲:۲۲۸) ہے۔ قَرَاءَ جو کے معنی ''پڑھنے'' کیلئے جاتے ہیں، وہ اساسی مفہوم نہیں ہے بلکہ ثانوی مفہوم ہے۔ اَلْقِرَاءۃ کے معنی حروف و کلمات کو ترتیب کے ساتھ جمع کرنے کے ہیں۔ کیونکہ ایک حرف کو بولنے کو قراۃ نہیں کہا جاتا۔ یہ فعلان کے وزن پر مصدر ہے جیسے کفران ورجحان۔ قرآن کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ تمام کتب سماویہ کے ثمرہ اور تمام علم وحکمت کے ماحصل کو اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہے۔ جیسا کہ تَفْصِیْلَ کُلِّ شَیْءٍ (یوسف ۲:۳۶) اور بُنْیَاناً لِکُلِّ شَیْءٍ (النمل ۱۶:۸۹) اور اس قسم کی دوسری آیات سے مفہوم پایا جاتا ہے۔ [۲]

مرزا ابوالفضل نے غریب القرآن میں لکھا ہے قَرَاءَ کے معنی اعلان کرنے کے ہیں۔ اِس اعتبار سے قرآن کے معنی ایک اعلان کے ہوں گے۔ اگر دونوں مفہومات کو اکٹھا کردیا جائے تو معنی ہوں گے ''ایک ایسا اعلان جو علم وحکمت اور جملہ انبیائے کرام کی تعلیمات کے مجموعہ پر مشتمل ہے۔

قرآن حکیم کے ساتھ صحابہ کرام اور سلف صالحین کو شغف اور عشق تھا۔ وہ آیات الٰہی کے مطالب پر ہروقت کامل غور وفکر کرتے رہتے تھے۔ اُٹھتے، بیٹھتے، سوتے،

---

[۱] تاج العروس میں ہے کہ ابن شمیل نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص اُن کے سامنے سُبحان اللہ کی تفسیر بیان کررہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ تم نے گھوڑے کو نہیں دیکھا کہ وہ کس طرح اپنی تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ رہا ہوتا ہے جیسا کہ تیر رہا ہو۔ گویا تسبیح سے مُراد اللہ تعالیٰ کی طرف دوڑ کر، اڑ کر پہنچنا اور اس کی اطاعت میں ہروقت سرگرم عمل رہنا ہے ایم راغب نے بھی لکھا ہے کہ سبح کے معنی ''پانی یا ہوا میں تیزی سے گذرنا'' ہے۔

Marfat.com

جاگتے قرآن حکیم اُن کے پیش نظر رہتا۔ بعض صحابہ تو ایک ایک سورۃ پر آٹھ آٹھ برس لگا دیتے۔ مسلمانوں سے جب رُوحِ جہاد اور اجتہاد ختم ہوگئی اور اسلام نے اُن کے نزدیک ایک جامد، متصلّب مذہب کی شکل اختیار کرلی تو قرآن حکیم میں غور و فکر کرنے کی بجائے اس کا رسمی ادب، سطحی تعظیم باقی رہ گئی۔ آج کل تو یہ حال ہے کہ اوّل تو اسے ریشمی غلافوں اور خوبصورت جزدانوں میں لپیٹ کر بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جزدان گرد آلود ہو جاتے ہیں، اُن کو جھاڑنے کی نوبت تک نہیں آتی۔ اگر کوئی اس کی طرف توجہ کرتا بھی ہے تو ایک ایک لفظ کے بدلے دس دس نیکیوں کا ثواب حاصل کرنے کی خاطر یا کئی کئی ''ختم'' کر کے مُردوں کو ثواب پہنچانے کی غرض سے۔ اکثر اس کی رواں تلاوت کو ذریعہ نجات سمجھے بیٹھے ہیں اور اس کو ایک چیستاں تصور کرتے ہیں۔ کہیں اس سے اسم اعظم کی تلاش ہے، کہیں تعویذ بن کر گلے کا ہار ہو رہے ہیں، کہیں اس سے استخارے اور فالیں نکالی جا رہی ہیں، کہیں فسون اور سحری اعمال ہیں۔

حیات از حکمت قرآں نگیری ، بہ بند صوفی و ملا اسیری
ترا کارے با آیاتش جزایں نیست ، کہ از یٰسین او آساں بمیری

ترجمہ: ''اے مسلمان! تو قرآن حکیم سے زندگی حاصل نہیں کرتا بلکہ اس کی بجائے صوفیوں، مولویوں اور پیروں کے چکر میں گرفتار ہے۔ قرآن پاک تیرے لیے محض اس لیے رہ گیا ہے کہ نزع کے وقت تنگی کو دور کرنے کیلئے تو سورۂ یاسین کی آیات کی تلاوت کرلیتا ہے۔'' (علامہ اقبالؒ)

اس کی وہ آیات جن کا بار اُٹھانے کی کوہ ہمالیہ میں بھی طاقت و سکت نہیں جس کے متعلق ارشاد ہے کہ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ. (الحشر ۵۹: ۲۱)

ترجمہ: ''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو اے مخاطب! تو اس کو دیکھتا کہ اللہ کے خوف سے دب جاتا اور ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ ہاں! انہیں آیات کو کاغذ کے ٹکڑوں پر ناجائز مقدموں کی کامیابی یا کسی معشوق کی تسخیر کیلئے لکھ لکھ کر بھیجا جا رہا ہے۔''

Marfat.com

چنیں دور آسمان کم دیدہ باشد　　که جبریل امیں رادل خراشد

ترجمہ: ''آسمان کا ایسا دور بھی کسی نے نہیں دیکھا ہوگا جس سے کہ جبریل اِس کا دل بھی مجروح ہوجائے۔''

اس سے بڑھ کر تعلّب اور استہزا بالقرآن اور کیا ہوسکتا ہے؟

اگر کوئی طبقہ ایسے افعال سے نسبتہً محفوظ ہے تو اُس میں مطالبِ قرآن کے بارے میں ہولناک افتراق ہے۔ لفظی نزاع ہے تفریق آراء ہے، تشتتِ فکر ہے، انتشارِ نظر ہے، ذہنی ویرانیاں ہیں، کہیں اللہ کو دادِ سخن مل رہی ہے، تحسین ناشناس کی جاہلانہ واہ واہ ہے۔ نہ قرآن کے غرض و مطلب سے محبت ہے، نہ مقصود سے سروکار ہے، نہ تعمیل پیش نظر ہے۔ قرآن نے اپنے نزول کی غرض یہ بتلائی:۔

کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْکَ مُبٰرَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ. (ص ۳۸: ۲۹)

ترجمہ: ''اے رسولؐ! آپ کی طرف بابرکت کتاب اسلئے نازل کی گئی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر کریں اور ارباب عقل و فراست صحیح نتیجہ اخذ کر کے عبرت و نصیحت حاصل کریں۔

ارشاد فرمایا کہ جو قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے اُن کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا. (محمد ۴۷: ۲۴)

ترجمہ: ''تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل لگ رہے ہیں۔''

قرآن نے تو اس امر کی تلقین کی ہے کہ میری دعوت کو بربنائے بصیرت تسلیم کرو۔

فرمایا جو میرے بندے ہیں جب اُن کے آگے اُن کے رب کی آیات پیش کی جاتی ہیں وہ اُن کو غور و فکر کے بعد اختیار کرتے ہیں، اَن پڑھ، اندھے اور بہرے بن کر گر نہیں پڑتے۔ اُن آیات پر تدبر و تفکر کرتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا. (الفرقان ۲۵: ۷۳)

Marfat.com

ترجمہ: ''اور جب انہیں اللہ کی آیات کے ذریعے نصیحت کی جاتی ہے تو اُن پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گرتے۔''

اِس مضمون کی بے شمار آیات ہیں جن میں قرآن پر تدبر و تفکر کی دعوت دی گئی۔ قرآن سے درحقیقت فائدہ بھی وہی اٹھا سکتا ہے جو ایک بیدار اور فعال (ACTIVE) ذہن رکھتا ہو یا سننے والے کان۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَ ہُوَ شَہِیۡدٌ. (ق ۵۰: ۳۷)

ترجمہ: ''بے شک اس میں یاددہانی ہے، اُس شخص کیلئے جس کے پاس عقل ہو یا متوجہ ہو کر بات پر کان دھرے۔''

قرآن حکیم فکر و تدبر کی چیز ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو انسان کو فکر و تدبر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ انسان کی عقل کی تربیت کرتی ہے۔ اُس کے فکر و استدلال کی قوتوں کو اُبھارتی ہے۔

وَ ہُوَ الَّذِیۡ مَدَّ الۡاَرۡضَ وَ جَعَلَ فِیۡہَا رَوَاسِیَ وَ اَنۡہٰرًا ؕ وَ مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیۡہَا زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ یُغۡشِی الَّیۡلَ النَّہَارَ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ. وَ فِی الۡاَرۡضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّ زَرۡعٌ وَّ نَخِیۡلٌ صِنۡوَانٌ وَّ غَیۡرُ صِنۡوَانٍ یُّسۡقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۟ وَ نُفَضِّلُ بَعۡضَہَا عَلٰی بَعۡضٍ فِی الۡاُکُلِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ. (الرعد ۱۳: ۳،۴)

ترجمہ: ''اور دیکھو وہی ہے جس نے زمین کی سطح پھیلا دی، اُس میں پہاڑ بنا دیئے، نہریں جاری کر دیں اور ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے، دو دو قسموں کے اُگا دیئے۔ اُس نے رات اور دن کے بتدریج ظاہر ہونے کا ایسا قاعدہ بنا دیا کہ دن کی روشنی کو رات کی تاریکی ڈھانپ لیا کرتی ہے یقیناً اس بات میں اُن لوگوں کیلئے کتنی ہی نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔''

''اور دیکھو زمین میں طرح طرح کے ٹکڑے ہیں۔ ایک دوسرے سے ملے ہوئے۔ ان میں

Marfat.com

انگور کے باغ ہیں، غلہ کی کھیتیاں ہیں، کھجور کے درخت ہیں باہم دگر ملتے جلتے ہوئے اور بعض ایسے کہ ملتے ہوئے نہیں۔ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں مگر ہم جنس ان کو بعض پر بعض میں برتری دے دیتے ہیں۔ یقیناً اس بات میں اُن لوگوں کیلئے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں'' آیات نمبر (۳:۲) کے خاتمہ پر لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ کے الفاظ آئے ہیں اور (۴:۱۳) کے خاتمہ پر لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ کے، پھر ان دونوں مقامات پر ان الفاظ سے پہلے آیا ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ اس میں دلیلیں ہیں۔ لیکن کیا دلیلیں ہیں اور کس چیز پر؟ یہ کچھ نہیں بتایا۔ صرف یہی فرمایا کہ جو تفکر کریں گے یا عقل سے کام لیں گے خود معلوم کرلیں گے۔ مقصد یہ ہے کہ مخاطب اپنے عقل وفکر کی قوتوں سے کام لے کر خود یہ دلیلیں معلوم کرے۔ [1]

تفسیر ومفسّر

عہد رسالت میں صحابہ کرام بالعموم قرآن کی آیات میں غور وفکر کرتے تھے لیکن اس ضمن میں بعض شخصیتیں امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ خلفائے اربعہ، حضرت عبداللہؓ بن عباس، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت اُبیؓ بن کعب، حضرت ابو موسیٰؓ اشعری، حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ، حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ، حضرت جابرؓ بن عبداللہ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت انسؓ بن مالک اور اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم ہیں۔

عہد صحابہ کے بعد تابعین میں سے فہم قرآن کے سلسلے میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

حضرت عکرمہؓ مولیٰ ابن عباس (متوفی ۱۰۵ھ) حضرت سعیدؓ بن جبیر کوفی ۹۵ھ،

---

[1] اسی طرح دیکھئے (النحل: ۱۰-۱۳)

Marfat.com

حضرت مجاہدؒ بن جبیر ۱۰۳ھ، حضرت ضحاک بن مزاحم ۱۰۵ھ، حضرت عطا بن رباح ۱۱۴ھ، حضرت حسن بصری ۱۱۰ھ۔ ۱

ان کے علاوہ طاؤس، عطا بن ابی سلمہ، محمد بن کعب، ابوالعالیہ، عطیہ، قتادہ، مسلم، مرہ ہمدانی، ابو مالک، ربیع بن انس کے نام ہیں۔

تابعین کے بعد تبع تابعین میں جو اصحاب تفسیر قرآن کیلئے مشہور ہوئے وہ حسب ذیل ہیں۔

عطار بن دینار (المتوفی ۱۲۶ھ) مقاتل بن سلیمان (المتوفی ۱۵۰ھ) سفیان ثوری (المتوفی ۱۶۱ھ) وکیع بن الجراح (المتوفی ۱۵۶ھ) سفیان بن عینیہ اور امام مالکؒ۔

ان کے علاوہ عبدالرزاق ابن جریج، اسحاق بن راہویہ، آدم بن ایاس، شعبہ بن حجاج، ابی بکر بن شیبہ، یزید بن ہارون، روح بن عبادہ، عبد بن حمید ہیں۔

کتب تفاسیر

کشف الظنون میں ۹۰۰ تفسیروں کا ذکر ہے۔ نواب صدیق حسن خان مرحوم نے اس سے بھی زیادہ نام گنائے ہیں۔ چند مشہور تفسیروں کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) جامع البیان تفسیر ابن جریرؒ ۳۰ جلدوں میں (۲) تفسیر ابن غندر (۳) تفسیر ابن ابی حاتم (۴) تفسیر امام حاکم (۵) تفسیر ابن حیان (۶) تفسیر ابن فورک (۷) تفسیر ابن ابوطالب مکی (۸) تفسیر امام ماوردی (۹) تفسیر ابو مسلم اصفہانی ۲ ۲۰ جلدوں میں (۱۰) تفسیر امام اسفرائینی (۱۱) تفسیر امام الحرمین اُستاد امام غزالیؒ (۱۲) یاقوت التاویل

---

۱ اس عہد میں اسرائیلیات تفسیر کا بڑا جزو بنتی گئیں۔ تبع تابعین کے زمانہ میں اسرائیلی روایات اور زیادہ ہوگئیں۔ ابن جریج ان کے امام تھے۔ ان کا ذکر آگے آرہا ہے۔

۲ اس تفسیر کو اشاعرہ نے جلا دیا تھا۔ امام فخر الدین رازیؒ اس تفسیر کی تعریف کرتے ہیں اور اپنی تفسیر کبیر میں اس کے اقتباسات دیئے ہیں۔ اُن اقتباسات کو جمع کر کے ''الہلال کلکتہ'' کے مطبع میں شائع کیا گیا تھا۔ اس کا اُردو میں ترجمہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

Marfat.com

تفسیر امام غزالی ۴۰ جلدوں میں (۱۳) تفسیر امام بغوی (۱۴) تفسیر کشاف از علامہ جار اللہ زمخشریؒ (۱۵) تفسیر امام ابن جوزی ۴۰ جلدوں میں (۱۶) تفسیر شیخ محی الدین ابن عربی (۱۷) تفسیر سخاوی (۱۸) انوار التنزیل تفسیر بیضاوی (۱۹) تفسیر خازن از شیخ علاؤ الدین علی بن محمد (۲۰) تفسیر بحرالمحیط از ابوحیان اندلسی ۸ جلدوں میں (۲۱) تفسیر علامہ مجد الدین فیروز آبادی صاحب قاموس (۲۲) تفسیر امام بلقیسی (۲۳) کتاب الجامع فی التفسیر ۳۰ جلدوں میں (۲۴) تفسیر ابن النقیب ۵۰ سے زائد جلدوں میں (۲۵) کتاب التحریر والتجیر ۵۰ سے زائد جلدوں میں (۲۶) تفسیر نودی ۱۲۰ جلدوں میں (۲۷) تفسیر حدائق ذات بہجۃ ۵۰۰ جلدوں میں (۲۸) تفسیر از علامہ ابن تیمیہؒ (۲۹) تفسیر مدارک التنزیل ۷ جلدوں میں (۳۰) تفسیر معالم التنزیل ۸ جلدوں میں (۳۱) تفسیر جامع الاحکام القرآن (تفسیر قرطبی) (۳۲) تفسیر کبیر ۸ جلدوں میں (۳۳) رُوح المعانی از علامہ شہاب الدین سید محمود آلوسی ۹ جلدوں میں (۳۴) تفسیر ابی مسعود (۳۵) تفسیر جلالین مع کمالین (۳۶) تفسیر فتح القدیر از علامہ شوکانی (۳۷) تفسیر مریسی از علامہ شرف الدین ۲۴ جلدوں میں (۳۸) تبصیر الرحمٰن از شیخ علی مہائمی (۳۹) تفسیر بقاعی از شیخ محمد ابراہیم بقاعی (۴۰) نظام القرآن از علامہ حمید الدینؒ فراہی (۴۱) سواطع الالہام شیخ ابوالفیض فیضی۔

تنقید تفسیر

کتب تفاسیر میں سب سے پہلی جامع کتاب جو لکھی گئی وہ ابن جریرؒ (المتوفی ۳۱۰ھ) کی تفسیر ہے۔ اس کا نام ''جامع البیان'' ہے۔ یہ تیس ۳۰ جلدوں میں ہے۔ یہ تمام قرآن کے تفسیری علم کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ اُم التفاسیر کہلاتی ہے۔ اس کتاب کے لکھنے میں امام موصوف نے بڑی محنت اور کاوش ذہنی کی۔ [۱] اس سے ماقبل زمانہ میں کوئی ایسی تفسیر موجود نہ تھی اور مابعد زمانہ میں جو تفسیریں لکھی گئیں اس سے ماخوذ ہیں۔

---

[۱] امام موصوف کی لکھنے کی رفتار چالیس صفحات فی یوم بنتی ہے۔

Marfat.com

اسلئے آئمہ تفاسیر کے نزدیک اس کی بڑی قدر ومنزلت ہے۔علامہ ابوحامد اسفرائنی اس تفسیر کے متعلق لکھتے ہیں۔**لو سافر رجل الی الصین حتی یحصل له کتاب تفسیر محمد بن جھیرم یکن ذلک کثیر** (اگر کسی شخص نے چین کا سفر کر کے تفسیر ابن جریر کو حاصل کر لیا تو یہ کوئی بڑی بات نہیں)۔

لیکن اس میں جو کمی رہ گئی ہے وہ یہ کہ امام موصوف نے آیت کی تفسیر کرتے وقت اُس سلسلہ میں روایات اور سلف کے اقوال بغیر جرح وتنقید کے جمع کر دیئے ہیں جن سے یہ کتاب رطب و یابس کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے۔علمی حقائق و معارف، منکرد موضوع یا ضعیف اقوال و روایات کے ساتھ مل جل گئے ہیں جس کی وجہ سے جواہر ریزے خزف ریزوں میں گُم ہو کر رہ گئے ہیں۔ایک شخص جب تک پوری قرآنی بصیرت، اجتہادی ذوق اور عقلی کاوش سے کام نہ لے، اس کتاب سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرسکتا۔علامہ ابن کثیر نے جو اپنی تفسیر لکھی ہے وہ اسی کا خلاصہ ہے۔انہوں نے اگرچہ روایات پر تنقید کی ہے لیکن کوئی زیادہ مفید خدمت سرانجام نہیں دے سکے۔

تفسیر کبیر ایک اہم تفسیر ہے۔امام فخر الدین عمر رازی (المتوفی ۶۰۶ھ) کی تصنیف ہے۔نام مفاتیح الغیب ہے۔آٹھ جلدوں میں ہے۔رازی معقول اور منقول دونوں کے ماہر ہیں۔بعض مقامات کی تشریح بہت عمدہ کی ہے مجموعی حیثیت سے یہ کتاب متکلمانہ قیل وقال کا مجموعہ ہے۔مسلکِ اعتزال کے مقابلے میں مسلکِ اشعریت کی تائید وحمایت میں قرآن کی آیات کی کھینچا تانی کی گئی ہے۔کلامی بحثوں کے شیدائیوں کیلئے ایسی کوئی کتاب نہیں۔قرآن حکیم کو سمجھنے میں یہ کتاب مفید نہیں۔صاحب کشف اِس کے متعلق لکھتے ہیں۔

قال ابوحیان فی البحر، جمع الامام الرازی فی تفسیرہ اشیاء کثیرۃ طویلة لا حاجة لھا فی علم التفسیر ولذالک قال بعض العلما و فیه کل شی الاالتفسیر.

Marfat.com

ترجمہ: ''ابوحیان نے بحر میں لکھا ہے کہ امام رازی نے اپنی تفسیر میں بہت سی چیزیں درج کر دیں جن کی تفسیر میں کچھ ضرورت نہ تھی۔ اس لیے بعض علماء نے کہا ہے کہ امام رازی کی تفسیر میں سب کچھ ہے مگر تفسیر نہیں۔''

ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگرچہ آج کل اس کی کوئی افادیت نہیں لیکن اپنے زمانہ میں مفید تھی۔ لیکن یہ ایک ایسی تفسیر ہے کہ اپنے زمانہ میں بھی مفید نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ بسا اوقات اشاعرہ کے کلامی نظریات کو صحیح ثابت کرنے میں حدود تفسیر سے اس قدر تجاوز کر جاتے ہیں کہ اگر کوئی آیت اُن کو صریحاً مسلکِ اشاعرہ کے خلاف نظر آتی ہے تو اُس کی تردید میں بھی اُن کو باک نہیں ہوتا کہ ہمارا اصول برہانیات (کلامی مسائل) سے ثابت ہے وہ محض اس بناء پر مجروح نہیں ہو سکتا کہ ایک آیت کے الفاظ جن کی دلالت تمام تر سماع پر مبنی ہے، اس کے خلاف ہے۔ اس رجحان تفسیر کے ساتھ قرآن کا کتاب ہدایت ہونا بالکل خارج از بحث ہو جاتا ہے۔ یہاں قرآن مجید راہنما و امام نہیں رہتا بلکہ اس کو چند کلامی نظریات کے تابع بن کر چلنا پڑتا ہے اور یہ چیز دوسرے الفاظ میں کتاب الٰہی کی نفی ہے۔[1]

علامہ اقبالؒ نے امام رازی کے متعلق کہا ہے۔

چوں سُرمہ رازی را از دیدہ فرو شستم   تقدیرِ اُمم دیدم پنہاں بکتاب اندر

ترجمہ: ''جب میں نے رازی کے سرمہ کو آنکھوں سے دھو ڈالا تو میں نے کتاب (قرآن) میں اُمتوں کی تقدیر مخفی دیکھی۔'' (اقبالؒ)

تفسیر کی ایک اور اہم کتاب علامہ جار اللہ زمخشری (المتوفی ۵۸۱ھ) کی کشاف ہے۔ دو جلدوں میں ہے۔ عقائد کے لحاظ سے علامہ موصوف معتزلی ہیں۔ ادب، بلاغت، لُغت، اعراب کے امام ہیں۔ امام رازیؒ بھی (جو اِن کے حریف تھے) ان کی اس قابلیت کے معترف ہیں اور ان کی عبارتیں اپنی تفسیر میں ہو بہو نقل کرتے ہیں۔ قرآن

---

[1] تدبر قرآن از امین احسن اصلاحی۔

Marfat.com

کے طالب علم کیلئے یہ کتاب مفید ہے۔

یہ تو تفسیر کی چند کتابوں کا ذکر تھا۔ قرآن کے تفسیری لٹریچر پر جب ہم ایک مجموعی نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سوائے چند تفسیر نگاروں کے باقی مفسرین نے ذہنی کاوش سے کام نہیں لیا۔ اُن کی تفسیروں میں طالب علم کی تشنگی کو دُور کرنے کا کوئی سامان نہیں۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں سے لے کر قرونِ اُخیرہ تک جس قدر مفسر پیدا ہوئے، اُن کا طریق تفسیر ایک رُو بہ تنزل معیارِ فکر کی زنجیر ہے جس کی ہر پچھلی کڑی پہلی سے پست تر، اور سابق، لاحق، سے بلند تر واقع ہوئی ہے۔ یہ صورت حال فی الحقیقت مسلمانوں کے عام دماغی تنزل کا قدرتی نتیجہ تھا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ قرآن کی بلندیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے، تو کوشش کی کہ قرآن کو اُس کی بلندیوں سے اس قدر نیچے اُتار لیں کہ اُن کی پستیوں کا ساتھ دے سکے۔ [1]

تفسیر کے سلسلے میں زیادہ تر اعتماد روایات پر کیا گیا۔ قرآنِ حکیم کی آیات کی تشریح کیلئے روایات کو پیش کیا گیا حالانکہ تفسیری روایات کا کثیر حصہ موضوع ہے۔ علامہ سیوطی کی کتاب ''اتقان'' میں ہے:۔

لطب تفسير ماخذ كثيره، اماتها اربعه، اول النقل عن النبى صلى الله عليه وسلم وهو الطر از المعلم لكن يحب الحذر من الضعيف منه المعضوع فانه كثير ولهذا قال احمد بن حنبل ثلاثه ليس لها اصل التفسير والتفسير والملاحم والمغازى.

ترجمہ: ''تفسیر کے بہت سے ماخذ ہیں جن میں چار اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اوّل وہ نقل ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے لیکن اس باب میں ضعیف و موضوع سے احتراز واجب ہے کیونکہ اس قسم کی روایات بہت ہیں۔ اِسی وجہ سے امام احمد ابن حنبلؒ [2] نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے (تفسیر، ملاحم)۔''

---

[1] ترجمان القرآن از ابوالکلام احمد رحمتہ اللہ علیہ۔

[2] یہ واضح رہے کہ حضرت امام احمد حنبلؒ، امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے اُستاد ہیں۔

Marfat.com

۲۔ مفسر کی طبیعت میں جو ذوق، فن یا علم غالب تھا۔ قرآن کی تفسیر کو اُس میں رنگ دیا۔ اُن کے علم میں جامعیت نہیں۔ علم دفن کے جس پہلو سے انہیں وابستگی تھی، سارے قرآن کی تفسیر اُسی نقطہ نظر سے کر دی۔ یونان کے فلسفہ سے متاثر ہوئے تو فلسفیانہ موشگافیاں بیان کرتے رہے، اگر علم کلام سے شغف ہے تو اپنی تفسیر کو کلامی قیل وقال کا مجموعہ بنا دیا، اگر فقہ سے لگاؤ ہے تو موقع اور محل کی مناسبت کا لحاظ نہ کرتے ہوئے فرعیات فقہ استنباط کرتے رہے، اگر صرف ونحو سے دلچسپی ہے تو صرف ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کی تین ہزار ترکیبیں بیان کر دیں لیکن اُس کا مفہوم ومطلب کچھ بھی پیش نہ کیا، اگر تصوف کا ذوق ہے تو سارے قرآن کو اُسی قالب میں ڈھال کر اُسے مجوسیت، جدید افلاطونیت (NEO-PLATONISM) اور پولوسیت اور ویدانت فلسفہ کا مرکب بنا دیا۔ اس سلسلے میں صاحب ''کشف الظنون'' لکھتے ہیں:۔

ثم صنف بد ذالک قوم عوانی شی من العلوم، و ملا کتابه بها غلب علی طبعه من الفن وقتصرفیه علی ما تمهر هو فیه، کان القرآن أُنزل لاجل هذا لعلم لا غیر مع ان فی بیان کل شی فالخوی تراه لیس لذهم الا الاعراب و تکثیر الاوجد المحمله فیه و ان کانت بعیدة ینقل واعد النحو و مسئله و فردعه و خلافیاته کالزجاج والواحدی فی البسیط وابوحیان فی البحر والنهر والاخباری لیس له شغل الاالقصص واستیفاءِ ها والاخبار عن سلف سواء کان صحیحة او باطلة و منهم التعلبی والفقهیه یکاد یسرد فیه الفقهه جمیعاً وربها استطر والی اقامة ادلة الرفرع الفقیهیة التی لا تعلق لها بالایة اصلا والجواب عن اولة المخالفین کالقرطبی و صاحب العلوم العقلیة خصوصاً الامام الرازی قد ملاء تفسیره باقوال الحکما والفلاسفة و خروج من سی الی سی حتی یقغی الناظر العجب. ترجمہ حسبِ ذیل ہے:۔

Marfat.com

''اِس کے بعد ایسے لوگوں نے تصنیف کی جنھوں نے کسی ایک علم میں فوقیت حاصل کی ہے اور اپنی کتاب کو اُس فن سے بھر دیا ہے جو اُس کی طبیعت میں غالب تھا، اور محض اُسی پر اکتفا کیا جس میں اُس نے مہارت حاصل کی تھی۔ گویا قرآن صرف اُسی علم کے لئے نازل ہوا تھا۔ حالانکہ اس میں ہر چیز کا بیان ہے۔ نحوی کو نقطہ اعراب اور وجوہ ترکیب ہی پیش نظر رہیں، خواہ وہ بعید از کار ہی کیوں نہ ہوں، وہ نحو کے قواعد، مسائل فروع اور خلافیات ہی کو داخل کرے گا۔ جس طرح زجاج اور واحدی نے ''بسیط'' میں اور ابو حیان نے بحر اور نہر میں کیا ہے۔ اخباری کو صرف قصے اور ان کی تکمیل ہی پیش نظر رہتی ہے، گذشتہ قصوں کا خیال رہتا ہے خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط۔ ثعلبی اُن لوگوں میں سے ہے۔ فقیہہ کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ سارے فقہ کو داخل کرے، بسا اوقات فقیہہ فرعیاتِ فقہ کی دلیلیں لاتا ہے حالانکہ نفس آیت سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور پھر مخالفین کے جواب بھی نقل کر دیتا ہے۔ اِس قسم کے لوگوں میں سے قرطبی ہے۔ ارباب علوم عقلیہ میں امام رازی ہیں جنھوں نے اپنی تفسیر کو حکما اور فلاسفروں کے اقوال سے بھر دیا ہے اور کہیں سے کہیں چلے جاتے ہیں جس سے دیکھنے والا تعجب میں رہ جاتا ہے۔''

Marfat.com

تفکر فی القرآن کی راہ میں رکاوٹیں

عرب تخیُّل

قرآن حکیم کے حقائق و بصائر پر دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں، جب تک ان کو چاک نہ کیا جائے قرآن کی تعلیمات کے صحیح اور اصل خدوخال نمایاں نہیں ہو سکتے۔ تفسیر میں علمی و تاریخی تحقیق و تنقید کی نسبت تخیل کی پرواز سے مضحکہ خیز حد تک کام لیا۔ الہیّات کی سطحی مُوشگافیوں سے حقیقت کی جگہ ظن و قیاس نے لے لی۔ اس ظن و قیاس سے ایک نیا افسانوی ادب (Mythology) وجود میں آ گیا۔ آسمان اور زمین کے آر پار سڑکیں تعمیر کیں۔ جنت کے درخت اور آبخورے گن ڈالے، دوزخ کے کلید برداروں اور محافظوں کے نام وضع کیے اور اس کے اندر بچھوؤں اور سانپوں کی لمبائی ناپ ڈالی، روح کی مفروضہ قسمیں وضع کیں، صاعقہ کو شہاب ثاقب سے گرے ہوئے لوہے کی تلوار یا گرز سمجھ لیا، جس کو رعد کا فرشتہ اپنے ہاتھ میں لے مارتا ہے، برق کے متعلق یہ انکشاف کیا کہ یہ ایک فرشتہ ہے جس کے چار منہ ہیں، ایک انسان کا چہرہ، دوسرا بیل کا چہرہ، تیسرا گدھ کا چہرہ، اور چوتھا شیر کا چہرہ۔ جس وقت وہ اپنی دم ہلاتا ہے تو چمک پیدا ہوتی ہے۔ روحوں کے مساکن اور سیرگاہیں قائم کیں، یاجوج ماجوج کے متعلق کہا کہ ان کے افراد کا قد ایک سو بیس گز ہے، ایک کان اوڑھنے اور دوسرا بچھونے کا کام دیتا ہے۔ جنگ بدر کے فرشتوں کے عماموں اور گھوڑوں کے رنگ بتائے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب عرب تخیل کا نتیجہ ہیں۔ وہم اور تخیل عرب طبیعت کا خاصہ تھا۔ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تربیت و تزکیہ اور بے پناہ قوت عمل سے چند

Marfat.com

برسوں کے اندر اہل عرب کو وقت کا بادشاہ بنا دیا تھا۔ خلافت علیٰ منہاج نبوت کے دور میں اہل عرب اعلائے کلمۃ اللہ میں مصروف رہے، لیکن جونہی اس مبارک دور کے اثرات ختم ہوئے، عرب اپنی فطرت پر لوٹ آئے۔ انسان کی فطرت کا بدلنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کو دیکھ لیجئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت بیضاء کو رکھتے ہوئے ان کی عارضی غیر حاضری میں اپنی عادت کے مطابق بچھڑے کی پرستش شروع کردی تھی۔ عرب تخیل کی دو اہم شقیں تھیں (۱) اوہامی شق (۲) شاعرانہ شق۔

اوہامی شق

جاہلیت کے عقائد جو کہ غیر مدوّن شکل میں تھے، ان کو قرآن کی تفسیر میں شامل کرلیا گیا۔ ان کے اوہام باطلہ اور تخیلات واہیہ قرآنی اعتقادات میں داخل ہوتے گئے۔ قیافہ شناسی، تفاؤل، تشاؤم، سحر، نجوم، [1] اسلامی معتقدات کا جزء بنتے گئے۔ طبائع کوبی اور ارواح فلکی اسمائے الٰہی کے مظاہر فرض کرلئے گئے۔ اسرار الحروف کے نام سے خجالت آفرین ڈھکوسلے ایجاد کیے، کہانت سے لگاؤ نے جفر، رمل اور حساب جمل کی شکل اختیار کی، جنات کے نسب نامے تیار کیے، ملائکہ کے فرضی گروہ بنائے۔ عذاب قبر [2] کے مظنون (ظن پر مبنی) طریقے بیان کیے۔ الغرض ظن وتخمین کے ان معاملات پر دل کھول کر بحثیں کیں اور انہیں اسلامی لباس پہنا کر قرآن کے اتھاہ مضامین میں خلط مبحث کردیا۔ ظن کے مضعف یقین وایمان اثرات کو پیش نظر رکھ کر قرآن نے اسی لئے اس کی بعض قسموں کو گناہ قرار دیا ہے۔

---

[1] ان سب اوہام باطلہ کی علمی تردید اپنے اپنے موقع پر آئے گی۔ انسان آج علم وفن کے اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ سیارے خود تخلیق وایجاد کرکے خلا میں چھوڑ رہا ہے، لیکن ہم ابھی تک ستاروں کے سعد ونحس اثرات پر یقین رکھتے ہیں۔

[1] ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے   کہ خاک ہے تو تابع ستارہ نہیں

[2] عذاب قبر کی حقیقت اور اس کی علمی تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔

Marfat.com

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ. (الحجرات ۴۹:۱۲)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اکثر قسم کے ظن سے بچتے رہا کرو کیونکہ بعض ظن داخل گناہ ہیں۔''

نیز فرمایا:

وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا. (النجم ۵۳:۲۸)

ترجمہ: ''ان کو اس کے متعلق کچھ علم تو ہے نہیں، وہ تو نرے ظن اور اٹکل پچو پر چلتے ہیں اور ظن، یقین کے مقابلے میں کارآمد نہیں ہوسکتا۔''

شاعرانہ شق

عرب تخیل کی دوسری شاعرانہ شق ہے۔ اہل عرب کو شاعری کے ساتھ عشق تھا۔ شاعری ان کی گھٹی میں تھی۔ شعر گوئی کا یہ عشق تھا کہ سفر و حضر، میدان جنگ، مناظرات، خطابات، بلکہ عالم خواب میں بلاتامّل شعر کہہ دیتے۔ شعر کے اس جنون نے انہیں لفظ پرست اور صورت پرست بنادیا۔ اس ظاہر پرستی کے مشاغل نے حقیقت اور معنویت کو نظرانداز کردیا۔ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ [1] کو فصاحت اور بلاغت سے متعلق سمجھ لیا گیا۔ اس سلسلے میں لغت، صرف ونحو، علم الانشا، علم المعانی، علم البدیع، علم رسم الخط وضع ہوگئے۔ یہ سب چیزیں زبان کو جلا دے سکتی ہیں، علم نہیں بن سکتیں۔

قرآن کی ظاہر پرستی کی بناپر جس طرح خلیل ابن احمد، ابوالاسود الدولی، سیبویہ، کسائی، قطرب، اسمعی نے قرآن کو ادب و بلاغت کی صحیح محک مان کر اسے کئی مستقل علوم ادبیہ کا ماخذ و مصدر قرار دیا۔ اگر رازی، ابن رشد، الکندی، فارابی، ابن حزم، ابن الہیثم، البیرونی وغیرہ کتاب اللہ کو قانون فطرت کا صحیح ضابطہ اور مشیت خدا کی صحیح تصویر مان کر مستقل اور ناقابل رد طبیعی، حیاتیاتی، نفسیاتی، معاشرتی اور معیاری علوم کی بنیاد

[1] قرآن حکیم کا یہ دعویٰ علم، حکمت اور ہدایت سے متعلق ہے۔ اس کی تشریح سورہ بقرہ کی آیات نمبر ۲۳۔۲۴ میں آئے گی۔

Marfat.com

ڈالتے اوران علوم کے مطالعہ میں قرآن کی حکمت اور ضابطہ کو عیاں کر دیتے تو دنیا کی امامت مسلمان قوم کیلئے مقدر ہو جاتی۔

اسرائیلیات

اسرائیلیات سے مراد یہودیوں کے قصص وخرافات ہیں۔قرآن حکیم ایک ایسی کتاب ہے جس میں علم وحکمت اور انبیائے کرام کی تعلیمات کو جمع کر دیا گیا ہے۔اس میں علمی حقائق بھی ہیں اور تاریخی بھی۔دنیا کی پیدائش، اجرام فلکی کی پیدائش، خلافت آدم، انبیاء کرام اوران کی اقوام کی سرگزشت اس کے موضوعات سے ہیں۔ان میں بعض امور کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، بعض کو مجمل حیثیت سے اور بعض کے متعلق اشارات پر اکتفا کیا ہے۔انسانی عقل نے ہر زمانے میں ان امور سے بحث کی ہے اور اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق ان کے جوابات دیئے ہیں۔قرآن حکیم میں بھی چونکہ ان کا ذکر آیا ہے، مسلمانوں نے ان کے متعلق دریافت کرنا شروع کیا۔چونکہ یہودی صاحب کتاب تھے اوران میں عالم بھی تھے، اسلئے جو نئے لوگ مسلمان ہوتے تھے وہ ان امور کے متعلق حالات اور اشارات کی تشریح و وضاحت ان سے پوچھتے۔ابن خلدون لکھتے ہیں کہ:

ترجمہ: ''بالعموم عرب نہ پہلے سے اہل کتاب تھے، نہ علم رکھتے تھے، ان کے اوپر بدویت غالب تھی۔جب ان کو موجودات کے اسباب، ابتدائے تخلیق اور اُمم سابقہ کے حالات وغیرہ جاننے کا شوق ہوتا تو اہل کتاب سے (جو مسلمان ہو گئے تھے)، دریافت کرتے۔یہ بھی زیادہ تر ان ہی کی طرح بدوی تھے اوران امور کو اسی قدر جانتے تھے جس قدر عوام اہلِ کتاب۔انہی کے بیانات لوگوں سے منقول ہو کر تفسیروں میں داخل ہو گئے اور بوجہ اس کے کہ ان کا تعلق احکام شرعیہ سے نہ تھا۔تدوین کے متعلق مفسرین نے مساعت سے کام لے کر ان کی طرف توجہ نہیں کی اوران کو کتب تفاسیر میں درج کر دیا۔''[1]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون

Marfat.com

تخلیق کائنات، تخلیق انسان، خلافت آدم، انبیائے کرام کی زندگیوں کے حالات بالخصوص حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت لوطؑ اورامم سابقہ کی تاریخ میں ایک غالب عنصر اسرائیلیات کا ہے۔متعلقہ مقامات پر ان روایات پر پوری تنقید کی جائے گی اور ضمناً یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ۔

یہ اُمت روایات میں کھوگئی   حقیقت خرافات میں کھوگئی (اقبالؒ)

فلسفۂ یونان

مسلمان علماء اور حکماء نے یونانی فلسفہ کی طرف بہت توجہ دی۔ یونانی فلسفہ نے مسلمان مفکرین کے اندازِ فکر میں وسعت تو ضرور پیدا کردی لیکن قرآنی بصیرت کو مسخ کردیا۔سقراط کے فلسفہ کا موضوع صرف انسان تھا۔افلاطون نے عالم محسوس کو بے اصل قرار دیا۔اس کے نزدیک حقیقت اعیان نامشہود (Invisible Ideas) ہیں۔اس کے برعکس قرآن فطرت کے مشاہدہ ومطالعہ کی دعوت دیتا ہے اور علم بالحواس کو حصول علم کا ذریعہ سمجھتا ہے۔مسلمانوں نے یونانی فلسفہ سے مسحور ہوکر فطرت کے مشاہدہ ومطالعہ کو نظرانداز کردیا۔روح اساساً (بنیادی طور پر) یونانی فلسفہ کے خلاف ہے۔افلاطون کے اعیان نامشہود کو حقیقت سمجھنے کے برعکس قرآن کہتا ہے:

وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ. (الروم:۳۰:۸)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے ارض وسماوات کو جو ان کے درمیان ہیں، حق پیدا کیا۔''

اولوالالباب (اربابِ عقل وبصیرت) جو کائنات کی خِلقت (پیدائش) میں تفکر کرتے ہیں، ان کی صدائے حال یہ بتلائی ہے۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً. (آل عمران:۳:۱۹۱)

ترجمہ: ''اے ہمارے پروردگار! آپ نے ارض وسما کو باطل پیدا نہیں کیا۔''

ارض وسما کو باطل خیال کرنے کو کفر سے تعبیر فرمایا:

Marfat.com

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا. (ص:۲۸:۲۷)

ترجمہ: ''اور ہم نے ارض وسماوات کو اور جو چیزیں ان کے درمیان موجود ہیں، باطل نہیں پیدا کیا ان کا باطل پیدا کرنے کا خیال ان لوگوں کا ہے جو کافر ہیں۔''

فلسفۂ یونان نے مسلمانوں کے فکر اور عمل دونوں کو متاثر کیا۔ فکر عقیم (بانجھ) ہو کر رہ گیا اور اس کا رشتہ علم سے منقطع ہو گیا، اور عمل کو مفلوج کر دیا گیا۔ [1] انبیائے کرام کو منطق یونانی کا پابند ثابت کیا گیا۔ قرآن حکیم کی مصطلحات کو یونانی فلسفہ کا مفہوم پہنایا گیا۔ اب اس مفہوم کا انکار قرآن حکیم کے انکار کے مترادف ہو گیا ہے۔ حالانکہ وہ

---

[1] علامہ اقبال نے افلاطون کے متعلق ایک طویل نظم لکھی ہے۔ اس میں سے چند اشعار یہ ہیں:

راہب۔ اول فلاطونِ حکیم — ازگروہ گوسفندان قدیم
رخش اُو درظلمت معقول گم — در کہستان وجود افگندہ سم
گفت سرّ زندگی در مُردن است — شمع راصد جلوہ از افسردن است
گوسفند درلباس آدم است — حکم اوبرجان صوفی مُحکم است
فکر افلاطون زیاں را سود گفت — حکمت او بود رانابود گفت
منکر ہنگامہ موجود گشت — خالق اعیان نامشہود گشت
زندہ جاں راعالم امکان خوش است — مردہ دل راعالم اعیاں خوش است
زاہب ماچارہ غیر از رم نداشت — طاقت غوغائے ایں عالم نداشت
قوم ہا از سکر اُو مسموم گشت — خُفت و از ذوق عمل محروم گشت

ممتاز ادیب اور دانش ور سعید بدر نے حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے اشعار کا ترجمہ یوں کیا ہے۔ یہ شعر ''اسرار خودی'' سے لیے گئے، ہیں جو علامہ اقبالؒ کی معرکۃ آلارا تصنیف ہے۔ علامہ فرماتے ہیں۔

ترجمہ: ''یونان کا حکیم افلاطون قدیم زمانے کا ایک راہب ہے۔ وہ اپنے عہد کی گوسفندوں یعنی بھیڑوں بکریوں کے گروہ میں ایک بھیڑ بکری ہی تھی۔ اس کی دانش وعقل کا گھوڑا معقولات کے اندھیروں میں راہ گُم کیے ہوئے تھا جو زندگی وہستی کے کوہستان میں عاجز ہو کر رک گیا تھا۔ وہ علم قیاس کے سحر وافسوں سے اسقدر مسحور ہوا کہ ہاتھ، آنکھ اور کان پر سے (جو تجرباتی علم کے ذرائع ہیں) اُس کا اعتبار جاتا رہا۔ وہ کہنے لگا کہ زندگی کا راز مرجانے میں ہے۔ (حالانکہ) شمع کے بُجھ جانے سے سینکڑوں جلوے پیدا ہوتے ہیں۔ حکیم افلاطون انسان کے لباس میں ایک گوسفند کی حیثیت کا حامل ہے۔ مگر وہ صوفی کے

Marfat.com

مفہوم یکسر غیر قرآنی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر خلود، حجت، برہان، تاویل، مثل، احد، سماوغیرہ بیسیوں الفاظ ایسے ہیں جن کا وہ مفہوم پیدا کرلیا گیا ہے جو عربی مبین کے بھی خلاف ہے اور اپنی لغت [2] اور مفہوم کے بھی خلاف ہے۔

تقلید

تقلید اور مقلّدین سے میری مراد آئمّہ فقہ اور کتب فقہ کے مقلّدین سے نہیں ہے، بلکہ مفسرین اور ان کی کتابوں کے مقلدین سے ہے۔ ابن جریر، امام رازی اور زمخشری کی تفسیروں کے بعد کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ اکثر و بیشتر یا تو انہی سے ماخوذ ومستنبط ہیں یا انہی کی تلخیص اور انہی کا اختصار ہیں۔ ان کے بعد ایسی تفسیریں بہت کم لکھی گئی ہیں جن کی اپنی کوئی مستقل بنیاد ہو۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ تفسیر نگاری کا مقبول عام طریقہ یہی ٹھہر گیا کہ جو کچھ لکھا جائے پچھلی تفسیروں میں سے کسی نہ کسی کی سند پر لکھا جائے۔ قرآن کے کسی ترجمہ یا تفسیر کے مستند ہونے کے لئے یہ بات کافی سمجھ لی گئی کہ اس کی ہر بات کی سند پچھلی تفسیروں میں سے کسی تفسیر میں مل جائے، چنانچہ ہمارے اس دور آخر میں مذہبی طبقہ کی طرف سے قرآن مجید کے جو ترجمے یا تفسیریں شائع ہوئی ہیں ان کی سب سے بڑی خصوصیت اگر کوئی بتائی جاسکتی ہے تو وہ غالباً یہی ہے کہ ان ترجموں اور تفسیروں کو ہماری پچھلی تفسیروں کی تصدیق وتائید حاصل

تخیلات وافکار پر حاوی ومسلّط ہے، گویا ہمارے صوفی بھی رازِ حیات مرنے ہی کو تصور کرتے ہیں۔ افلاطون کی فکر نے انسان کے نقصان کو فائدہ قرار دیا۔ اس کے فلسفہ نے موجود کو ناموجود کہا۔ اس نے کشمکش ہستی سے انکار کیا اور اُس نے وہ اعیان (صورِ عملیہ) پیدا کئے جن کا خارجی دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا، جس شخص کے اندر زندگی ہے اس کیلئے تو ممکنات کی دنیا بہتر ہے۔ البتہ مردہ دل کیلئے خیالی دنیا ہی بہتر ہے۔ اس راہب کیلئے فرار (Escapeism) کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔ وہ اس دنیا کے ہنگامے کی طاقت نہ رکھتا تھا۔ اس کے فکر کی مستی سے قوموں کے ذہن زہر آلود ہوگئے وہ سوگئیں اور ذوق عمل سے محروم ہوگئیں۔"

[2] تفکر فی القرآن کے بنیادی اصولوں میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ قرآن حکیم کی اپنی لغت ہے جو اسے انسانی لغت سے بھی بے نیاز کردیتی ہے۔ اس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

Marfat.com

ہے۔ان میں سے کسی نے بھی ان حدود سے باہر جانے کی جرأت نہیں کی ہے جو ابن جریر، امام رازی، امام سیوطی، امام شوکانی اور قاضی بیضاوی نے قائم کردی تھیں۔ عام طور پر ترجمہ یا تفسیر میں اس قول پر حرف رکھنے کی گنجائش نہیں سمجھی جاتی جو پچھلی تفسیروں میں سے کسی تفسیر سے ماخوذ ہو۔ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی کہ اس سہل اور مامون طریقہ کو چھوڑ کر قرآن مجید کے مشکلات کے حل کی راہ میں کوئی نیا قدم اٹھایا گیا ہو۔ [1]

چوتھی صدی ہجری کے بعد علوم اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ دور ختم ہوگیا اور شواذ و نوادر (شاذ و نادر کی جمع) کے علاوہ عام شاہراہ تقلید کی شاہراہ ہوگئی۔اس واء عضال نے جسم تفسیر میں بھی پوری سرایت کی۔ ہر شخص جو تفسیر کے لئے قدم اٹھاتا تھا، کسی پیش رو کو اپنے سامنے رکھ لیتا تھا اور پھر آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔اگر تیسری صدی ہجری میں کسی مفسر سے کوئی غلطی ہوگئی ہے، تو ضروری ہے کہ نویں صدی کی تفسیروں تک وہ برابر نقل در نقل ہوتی چلی آئے۔کسی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ چند لمحوں کیلئے تقلید سے الگ ہو کر تحقیق کرے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے؟ رفتہ رفتہ تفسیر نویسی کی ہمتیں اس قدر پست ہوگئیں کہ کسی قدر اول تفسیر پر حاشیہ چڑھا دینے سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ بیضاوی اور جلالین کے حاشیے دیکھو، ایک بنے ہوئے مکان کی لیپ پوت میں کس قدر قوت تصنیف رائیگاں گئی ہے۔

زمانے کی بد ذوقی نے بھی کج اندیشی کو سہارا دیا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرون اخیرہ میں درس و تداول کیلئے وہی تفسیریں مقبول ہوئیں جو قدماء کے محاسن سے یک قلم خالی تھیں۔وقت کا سوء انتخاب ہر علم و فن میں جاری رہا ہے۔ جو زمانہ جرجانی پر سکاکی کو آوسکاکی پر تفتازانی ترجیح دیتا تھا، یقیناً اُس دربار سے بیضاوی کو جلالین ہی کو حسن قبول کی سند مل سکتی تھی۔ [2]

---

[1] تدبر قرآن [2] ترجمان القرآن جلد اول

Marfat.com

تقلید میں ذہنی مغالطہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ قرآن حکیم میں تدبر و تفکر کی دعوت کا مخاطب صرف قدما کو سمجھ لیا گیا ہے اور اس غلط مفروضہ پر عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہمارے دماغی تنزل اور ذہنی پستی کا یہ عالم ہے کہ آج ہم جلالین و بیضاوی یا خازن و مدارک سے ہٹ کر ایک آیت پر بھی تدبر نہیں کر سکتے۔ قرآن میں تدبر و تفکر کی دعوت کے مخاطب ہم بھی ہیں بلکہ وہ لوگ بھی جو وقوع قیامت سے چند روز پہلے اس کرہ ارض پر موجود ہوں گے۔ علم کی کوئی انتہا نہیں۔ حضرت اعلم الناس ﷺ جن کے علم کی بلندی، وسعت اور گہرائی کا ہم تصور ہی نہیں کر سکتے ان کو حکم ہوتا ہے کہ:

قُلْ رَّبِّ زِدْنِي عِلْماً.

ترجمہ: ”اے ربّ میرے علم میں اضافہ فرما!

بقول علامہ اقبالؒ ؎

سیّد کل صاحب اُمّ الکتاب   پردگی ہا بر ضمیرش بے حجاب
گرچہ عین ذات را بے پردہ دید   ربّ زدنی از زبان او چکید

ترجمہ: ”سید دو جہاں اور صاحب اُم الکتاب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات ایسی ذات پاک ہے کہ اُن کے ضمیر پر خفیہ اور پوشیدہ اشیائے دو جہاں کے راز بے حجاب ہیں اور بلاشبہ انہوں نے ذات الٰہی کے انوار کو بغیر کسی پردہ کے واضح طور پر دیکھا۔ اس کے باوجود وہ دعا فرماتے رہے کہ یا اللہ! میرے علم میں اضافہ فرما۔“

انسانی علم کا ارتقاء جاری رہتا ہے۔ **اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ** اور **لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ**. کی صلائے عام ہمارے لئے بھی ہے۔ قرآن حکیم کی آیات میں تدبر قیامت تک ہوتا رہے گا۔ فطرت کی طرح اس کے علمی معارف و حقائق منکشف ہوتے رہیں گے اور ان میں اضافہ ہوتا رہے گا۔[1]

---

[1] اس کی مزید تشریح آگے آ رہی ہے۔

Marfat.com

تفسیر بالرّائے

تفسیر بالرّائے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان عقل و بصیرت سے کام نہ لے۔ قرآن حکیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتا ہے:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ. (یوسف: ۱۲، ۱۰۸)

ترجمہ: ''اے میرے رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! آپ کہہ دیجئے میرا طریق یہی ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ میں عقل و بصیرت پر قائم ہوں اور میرے پیروکار بھی۔''

یہاں رائے کا مطلب لغوی اعتبار سے نہیں بلکہ اصطلاحی حیثیت سے ہے۔ اس سے مراد ایسی تفسیر ہے جو اس لئے نہ کی جائے کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ بلکہ اس لئے کی جائے کہ ہماری رائے کیا کہتی ہے؟ قرآن کو امام بنانے کی بجائے اپنے پیچھے لگایا جائے۔ اس کے مختلف گوشے ہیں:

(ا) عقائد کے اختلاف سے جو مختلف فرقے وجود میں آئے تو مفسرین نے بھی اپنے اپنے عقیدوں کی تائید و حمایت شروع کی۔ اس سلسلے میں متکلمانہ بحثیں شروع ہوگئیں۔ ایک طرف امام رازی اشعریت کے علمبردار تھے تو دوسری طرف علامہ زمخشری اعتزال کے وکیل۔ ہر دو نے اپنے اپنے معتقدات کی تائید میں اپنے اعتقادات و مسلک کو حق ثابت کرنے کیلئے قرآن حکیم کی آیات کی کھینچا تانی کی ہے کہ کتاب الٰہی کے پیچھے چلنے کی بجائے اسے اپنے فکر و خیال کے پیچھے چلایا، ایسی تفسیر، بالرائے ہے۔

(ب) فقہ کی جب تدوین ہوئی اور مختلف مذاہب فقہ وجود میں آئے تو ان کے مقلدین نے یہ کوشش کی کہ قرآن کو اپنے اپنے فقہ کے مطابق ثابت کریں۔ اس سلسلے میں قرآن کی آیات کو مسائل پر زبردستی چپکایا گیا، ایسی تفسیر، تفسیر بالرّائے ہے۔

(ت) تصوف جب تک اخلاص فی العمل کا طریقہ رہا ایک پسندیدہ اور قابل تعریف چیز تھی، لیکن جب متصوفین نے اسے فتنہ کی شکل دیدی اس وقت یہ جدید

Marfat.com

افلاطونیت (Neo Platonism) مجوسیت اور ویدیانت فلسفہ کا مرکب بن کر رہ گیا۔قرآن کی تعلیمات ان چیزوں کی بنیادی طور پر مخالف ہیں۔بعض صوفیاء نے قرآن حکیم سے ایسی چیزوں کا جواز ثابت کرنے کیلئے آیات کی معنوی تحریف کی۔ مثال کے طور پر اکابر صوفیاء میں سے ایک صاحب اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ. خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ. کی یوں تفسیر کرتے ہیں کہ ”جنہوں نے اللہ کا ایمان اپنے دلوں میں چھپالیا، ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان نہ لائیں گے کیونکہ وہ میرے سوا کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان بھر کر مہر لگادی ہے اب ان میں کسی کی سمائی باقی نہیں رہی۔“

یہ تفسیر، تفسیر بالرّائے ہے۔

(د) تقلید کے ردعمل اور بعض دوسرے عوامل کی کارفرمائی کے نتیجہ میں متجدّدین کا طبقہ وجود میں آیا۔ **متجدّدین** سے مراد وہ لوگ ہیں جو جدید مغربی تہذیب سے متاثر ہوئے اور انہوں نے اس تہذیب کے مختلف اجزائے ترکیبی اور قرآن کی آیات میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے نعرہ تو لگایا تجدید کا لیکن وہ حقیقت میں مغرب کی نقالی اور تقلید کرتے ہیں۔ بقول حکیم الامت علامہ اقبالؒ۔

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک ہے جس کے تصور میں فقط بزم شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تقدیر مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ

جدیدیّت کے حامی ان لوگوں نے معذرت آمیز (Apologetic) رویہ اختیار کیا جو کہ یورپ سے ذہنی مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ اس ذہنی غلامی کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ

Marfat.com

قرآن حکیم کے احکام اور اصولوں کو اپنانے اور ان کی دائمی صداقت ثابت کرنے کی بجائے ان احکام اور اصولوں کے وجود سے یہ کہہ کر حتمی طور پر انکار کر دیا کہ یہ تو قرآن میں ہیں ہی نہیں۔ مسیحی یورپ نے اس نقطہ نظر سے کہ مسلمان جہاد کو ترک کر دیں، یہ کہہ دیا کہ اسلام تو تلوار کے زور سے پھیلا۔ بس پھر کیا تھا، ہم نے تمام کوشش یہ ثابت کرنے میں صرف کر دی کہ قرآن کے اندر تو مدافعانہ جنگ کی اجازت ہے (حکم بھی نہیں)۔ دور نبوت اور خلافت راشدہ کے تمام غزوات، سرایا، اور جنگیں صرف اسلئے لڑی گئیں کہ اس وقت کے غریب، بے کس، مظلوم اور بے بس مسلمانوں کو اذان دینے اور نماز پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ پردے کا ذکر آیا تو توڑ مروڑ کر ان کی نہایت بے باکی سے مصنوعی تحریف کر ڈالی اور کہا کہ قرآن تو پردہ کا حامی نہیں۔ تعدّد ازواج کے حکیمانہ اصول پر یورپ نے اعتراض کیا تو قرآن میں صرف وحدت ازواج کے حکم کو ثابت کرنے کیلئے يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ پر ہم نے نہ صرف عمل کیا بلکہ اس کی تائید میں جو مضامین اور رسالے شائع کیے تو انتہائی بددیانتی سے کام لے کر قرآن حکیم کی ان متعلقہ آیات کو پیش ہی نہیں کیا جو کہ ہماری پیش کردہ آیات کی معنوی تحریف کو بے نقاب اور قرآن کی صحیح تعلیم کی تشریح کرنے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہیں:۔

چنیں دور آسمان کم دیدہ باشد　　که جبریل امیں را دل خراشد

ترجمہ: ''آسمان نے ایسا زمانہ بہت کم دیکھا ہوگا جس میں جبریل کا اس کا دل بھی مجروح ہوا ہو۔

یہ معذرت آمیز رویہ اپنی ذہنی وعلمی شکست کا کھلا اعتراف ہے اور اس امر کا اعتراف ہے کہ یہ حضرات قرآن کے احکام اور اصولوں میں شک کرتے ہیں۔ ان کا معیار حق وصداقت قرآن حکیم نہیں بلکہ مغربی حقیقت ہے۔ قرآن کے احکام واصول صحیح، فطری اور حقیقی عقلیت کے منافی نہیں۔ حقیقی عقلیت اور مغربی عقلیت میں بڑا فرق ہے۔ مغربی عقلیت سطحی، مغرب کی تہذیبی روایات، ان کے تمدنی تصورات اور ان کے داخلی

Marfat.com

جمالیاتی ذوق کی حامل ہے۔ سطحی ماحول کے اثرات سے آزاد نہیں۔ حقیقی عقلیت کسی ملک یا قوم کے مخصوص روایات اور تصورات سے وابستہ نہیں ہوتی۔ معذرت خواہانہ ادب احساس کمتری پر دلالت کرتا ہے۔ نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کی نقطہ نظر سے ہمیشہ مہلک ہے۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ ہمارے سامنے ہے۔ یہ نشاۃ ثانیہ عرب قوم کی اندھی نقالی کا نتیجہ نہیں تھی۔ یورپ نے عرب کی ثقافت اور علم و ہنر کو اپنایا لیکن اپنے ذہنی حسیات، معنوی احساسات، تہذیبی روایات اور جمالیاتی تصورات کی اجتماعیت اور آزادی کو برقرار رکھا۔ انہوں نے اپنے تہذیبی ارتقاء کیلئے اہل عرب کے علم و ثقافت کو محض ایک زرخیز بنانے والی قوت (Fertelizer) کی حیثیت سے استعمال کیا جو کہ ان کی خود اعتمادی، عزت نفس اور افتخار قومی کا مظہر ہے۔ کوئی قوم اپنے قومی افتخار اور ماضی سے وابستگی کو قائم رکھے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

ہمارا رسول تو رسول تھا کہ ذات باری کے انوار و تجلیات سے بھی اس کی نظر خیرہ نہ ہوئی۔[2] ادھر اس کی امت کے دعویدار ہم ہیں کہ مغرب کی تہذیب کی ملمع سازی اور ظاہری چمک دمک نے ہماری نظر کو بہکا دیا۔

"فروغ مغربیاں" خیرہ کر رہا ہے تجھے — تری نظر کا نگہباں ہو صاحبٌ مازاغ

جس سے متاثر ہو کر ہم قرآن حکیم کے مطالب معانی بدل رہے ہیں۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں — ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

اس قسم کی تفسیر بالرائے ہے۔

---

[1] انشاء اللہ تعالیٰ سورۃ نساء میں ان آیات کے مطالب کو پوری شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔

[2] مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی۔

Marfat.com

جمع وترتیب قرآن

ترتیب قرآن کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ موجودہ ترتیب بعد کے لوگوں کی دی ہوئی نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ کی براہ راست ہدایت کے تحت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی قرآن کو اس طرح مرتب فرمایا تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی سورۃ نازل ہوتی تو آپ اسی وقت اپنے کاتبوں میں سے کسی کو بلاتے اور اس کو ٹھیک ٹھیک قلمبند کرا دینے کے بعد ہدایت فرما دیتے کہ کہ یہ سورۃ فلاں سورۃ کے بعد اور فلاں سورۃ سے پہلے رکھی جائے۔ اس طرح اگر قرآن کا کوئی ایسا حصہ نازل ہوتا جسے مستقل سورۃ بنانا پیش نظر نہ ہوتا تو آپ ہدایت فرما دیتے کہ اسے فلاں سورۃ میں فلاں مقام پر درج کیا جائے۔ پھر اس ترتیب سے آپ خود بھی نماز میں اور دوسرے موقع پر قرآن مجید کی تلاوت فرماتے اور اس ترتیب کے مطابق صحابہ کرام بھی اس کو یاد کرتے تھے اور یہ بات ثابت شدہ و تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن مجید کا نزول جس روز مکمل ہوا، اسی روز اس کی ترتیب بھی مکمل ہوگئی۔ جو اس کا نازل کرنے والا تھا، وہی اس کا مرتب کرنے والا بھی تھا۔ جس کے قلب پر نازل ہوا، اسی کے ہاتھوں اسے مرتب بھی کرایا گیا، کسی دوسرے کی مجال نہ تھی کہ اس میں مداخلت کرتا۔ [1] مشہور مفکر و مفسر علامہ حمید الدینؒ سورۃ قیامۃ کی آیت اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ. فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَهٗ. ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَهٗ. [2] کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس آیت سے تین باتیں نہایت واضح طور پر ثابت ہیں۔

---

[1] مقدمہ تفہیم القرآن۔ [2] قرآن کا جمع کرنا اور تمام جمع شدہ قرآن کا سنانا ہمارے ذمہ ہے۔ پس جب ہم اس تمام جمع شدہ قرآن کو سنا دیں تو تو اے رسول ﷺ اس کی پیروی کر پھر ہمارے ذمے اس کی تشریح و تبیین ہے۔

Marfat.com

قرآن کریم آنحضرت ﷺ کے عہد میں جمع ہو کر ایک خاص ترتیب سے آپ کو سنا دیا جائے گا۔ اگر یہ وعدہ آپ کی وفات کے بعد پورا ہونے والا ہوتا تو آپ کو اس قرأت کی پیروی کا حکم نہ دیا جاتا فَاِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ (پس جب ہم اس کو سنا دیں تو اس کی پیروی کرو)

۲۔ آپ کو حکم تھا کہ جمع قرآن کے بعد دوبارہ جس طرح آپ کو قرآن سنایا جائے، اس طرح آپ اس کو پڑھیں اور یہ بات عقلاً اور نقلاً دونوں اعتبار سے غلط معلوم ہوتی ہے کہ آپ پر کوئی بات وحی کے ذریعے سے آئے اور آپ اس کو امت تک نہ پہنچائیں۔ عقلاً تو اس کی غلطی بداہتہً واضح ہے۔ کسی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ نقلاً یوں غلط ہے کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ:

يَـٰٓأَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ. (مائدہ ٦٧:٦)

ترجمہ: ''اے رسول ﷺ! جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا اسے لوگوں تک پہنچا دیں، اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اپنی امت کو نہیں پہنچایا۔''

یہ ایک عام حکم ہے اس حکم کا تقاضا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے امت کو اس ترتیب کے مطابق قرآن سنایا ہو جس ترتیب پر اس کی آخری قرأت ہوئی ہے اور یہ ترتیب وہی ترتیب ہوگی جو لوحِ محفوظ میں ہے۔ کیونکہ آخری قرأت کا اصل کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہونا ضروری ہے۔ اس طرح جب قرآن نازل ہوا تو آخر میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو پورا قرآن اس کی اصل ترتیب کے مطابق سنا دیا۔ یہ بات صحیح اور متفق علیہ روایات سے ثابت ہے اور اس سے نظام قرآن کی بے شمار مشکلات آپ سے آپ حل ہو جاتی ہیں۔

وہ کتاب جو اپنے نزول کے پہلے روز ہی سے اس حقیقت کا صریح الفاظ میں اظہار کرتی ہے کہ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (العلق ۴:۹۶) اور اس کا نازل کرنے والا قلم اور کتاب

Marfat.com

کو مقسم کی حیثیت سے وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (القلم ۶۸: ۱) اور وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (الطور ۵۲: ۳۰۲) کے الفاظ پیش کر رہا ہو۔ اس کے متعلق تصور قائم کرنا کہ اسے ایک ترتیب کے ساتھ، اوراق پر مشتمل کتابی صورت میں اس رسول کی زندگی میں جس طرح نازل کیا گیا، محفوظ نہ کر دیا گیا۔ ایسا تصور یا تو سادہ لوح، عقل وبصیرت سے محروم، تقلید کی تاریکی میں پلا ہوا مسلمان کر سکتا ہے یا پھر بددیانت اور چالاک غیر مسلم۔ جس کتاب میں باہمی لین دین کے معاملات کو ضبط تحریر میں لانے کا حکم دیا گیا ہو کہ:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ. (بقرہ: ۲۸۲)

ترجمہ: "اے ایمان والو! جب بھی ایسا ہو کہ تم خاص میعاد کے لئے ادھار لینے دینے کا معاملہ کرو تو چاہیئے کہ لکھا پڑھی کر لو۔"

اور اس کی یہاں تاکید کر دی ہو کہ چاہے معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کے لکھنے میں سستی نہ کرو۔

وَلَا تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِه. (بقرہ: ۲: ۲۸۲)

ترجمہ: "اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا جب تک میعاد باقی ہے، دستاویز لکھنے میں کوتاہی نہ کرو۔"

کیا اس کتاب کی اپنی کتابت کے اہتمام کیلئے صرف ہڈیاں اور کھجور کے پتے ہی باقی رہ گئے تھے؟

انسانوں کے حقوق و فرائض کی نگہداشت کیلئے تو اس قدر تاکید سے کام لیا گیا ہو کہ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا لکھنے میں کوتاہی نہ کرو۔ کاتب کیلئے خاص ہدایت ہو کہ لکھنے سے گریز نہ کرے۔ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ (۲۸۲)

"کاتب کو لکھنے سے گریز نہیں کرنا چاہیئے کہ جس طرح اللہ نے اسے سکھلایا ہے، اسے لکھ دینا چاہیئے"، لیکن نوع انسانی کے حقوق و فرائض سے متعلق جو ضابطہ ہو اس کی کتابت وحفاظت کیلئے کوئی انتظام و اہتمام نہ ہو؟ کیا نزول قرآن کے وقت یا اس سے ماقبل

Marfat.com

زمانہ میں کسی کتاب کو اوراق کی صورت میں مدوّن کرنے کا طریقہ کسی کو معلوم نہ تھا؟ یہ تساہل صرف قرآن کے متعلق اختیار کیا گیا؟ اگر اوراق پر مشتمل مدوّن صورت میں کتابیں موجود نہ تھیں تو کافروں کا یہ کیا مطالبہ تھا؟

اَوْ تَرْقٰى فِى السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ. (بنی اسرائیل : ۹۲)

ترجمہ: "یہ لوگ کہتے ہیں ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے (۹۰) یا آپ آسمان پر ہمارے سامنے نہ چڑھ جائیں اور ہم آپ کے آسمان پر چڑھنے کا بھی کبھی باور نہیں کریں گے جب تک کہ آپ ہمارے پاس ایک لکھی ہوئی کتاب نہ لائیں جن کو ہم بھی پڑھ لیں۔"

سورۃ انعام میں فرمایا:

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِىْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ. (الانعام ۶:۷)

ترجمہ: "اور اے پیغمبر! اگر ہم تم پر ایک کتاب کاغذ پر لکھی ہوئی اتار دیتے اور یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے چھو کر دیکھ لیتے کہ سچ مچ کی کتاب ہے پھر بھی جن لوگوں نے انکار کی راہ اختیار کی کہ یہ کہتے یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ صریح جادوگری ہے۔"

یہ آیات بتلا رہی ہیں کہ کاغذوں [1] پر لکھی ہوئی کتابیں جن کو ہاتھ سے چھوا بھی جا سکے، موجود تھیں۔ جب صورتحال یہ تھی تو قرآن کی اس صورت میں کتابت اور تدوین کا کوئی انتظام فرائض رسالت میں شامل نہیں ہوتا؟

قرآن حکیم کے مطالعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو وحی آتی تھی، وہ فوراً لکھ لی جاتی تھی۔ منکرین قرآن کے متعلق فرمایا:

---

[1] یہ سوال علیحدہ ہے کہ کاغذ کس قسم کا تھا؟ کاغذ کسی قسم اور نوعیت کا ہو، بہر حال موجود تھا اور ان کاغذوں پر مشتمل کتابیں بھی موجود تھیں۔ کاغذ حضرت مسیح علیہ السلام سے کئی صدیاں قبل چین اور مصر میں ایجاد ہو چکا تھا۔ مصر میں اسے papyrus کہتے تھے۔ کاغذ کی تاریخ کیلئے دیکھئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا لفظ "papyrus"

Marfat.com

اَمۡ عِنۡدَهُمُ الۡغَيۡبُ فَهُمۡ يَكۡتُبُوۡنَ. (القلم ٦٨:٤٧)

ترجمہ: ''کیا ان کو علم غیب ہے جس کو وہ لکھ لیا کرتے ہیں۔''

وحی کی باضابطہ کتابت کا اہتمام ایک ایسا عام واقعہ تھی جس کا کفار بھی اقرار کرتے تھے۔

وَقَالُوۡۤا اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ اكۡتَتَبَهَا فَهِىَ تُمۡلٰى عَلَيۡهِ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا. (الفرقان ٢٥:٥)

ترجمہ: ''اور یہ کافر لوگ کہتے ہیں کہ یہ قرآن بے سند باتیں ہیں جو اگلوں سے منقول ہوتی چلی آئی ہیں جن کو اس شخص (یعنی پیغمبر) نے لکھوا لیا ہے پھر وہی باتیں اس کو صبح و شام پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔''

اس کتاب کا انتظام نہایت معزز اور نیک لوگوں کے سپرد تھا۔

فِىۡ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ. مَّرۡفُوۡعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ. بِاَيۡدِىۡ سَفَرَةٍ. كِرَامٍ بَرَرَةٍ. (عبس ٨٠:١٣،١٦)

ترجمہ: ''قرآن معزز، بلند، پاک صحیفوں میں ثبت ہے جو مکرم اور نیک لکھنے والوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔'' [1]

نیز اس آیت کریمہ میں صحف کا لفظ استعمال ہوا ہے صحیفہ لکھے ہوئے کاغذ کو کہتے ہیں اور صحف کے معنی ہوئے لکھے ہوئے اوراق کا مجموعہ۔

(راغب) وحی الٰہی کو ترتیب کے ساتھ جمع کر کے محفوظ رکھنے کا طریقہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں منکرین بھی متانت سے ہو یا استہزا سے، لکھی ہوئی کتاب کا مطالبہ کرتے تھے۔

بَلۡ يُرِيۡدُ كُلُّ امۡرِئٍ مِّنۡهُمۡ اَنۡ يُّؤۡتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً. (المدثر ٧٤:٥٢)

ترجمہ: ''اصل یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے کھلے ہوئے نوشتے دیئے جائیں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کو بھی صحیفے دیئے گئے تھے۔

اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰى. صُحُفِ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمُوۡسٰى. (الاعلیٰ:١٨،١٩)

ترجمہ: ''یہ اگلے صحیفوں میں بھی ہے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں میں بھی۔''

---

[1] اوصاف فرشتوں کے بیان کئے جاتے ہیں، لیکن ان کا اطلاق ان خادمان پر بھی ہوتا ہے جنہوں نے ابتداً کتابت وحی کی۔ (تفسیر ماجدی)

Marfat.com

نیز فرمایا:

وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ. (شعرا ۲۶: ۱۹۶)

ترجمہ: ''اس میں شک نہیں کہ یہ پہلی کتابوں میں بھی ہے۔''

اَلزُّبُرُ کے معنی ہیں لکھنا۔ اَلتَزْبِرَ کے معنی تحریر کے ہوتے ہیں۔ مُزْبَرُ قلم کو کہتے ہیں اور اَلـزَّبُوْر کے معنی ہیں لکھی ہوئی چیز، یعنی کتاب [1] (مَـزْبُوْر کے معنی میں) امام راغب کہتے ہیں ہر وہ کتاب جو جلی اور گاڑھے خط سے لکھی ہوئی ہو اسے مَـزْبُوْر کہتے ہیں۔ قتادہ [2] اور مجاہد نے زُبُر بمعنی کتب لکھا ہے یہ زَبُوْر کی جمع ہے۔

قرآن حکیم نے اہل کتاب سے ان کی آسمانی کتاب کو پیش کرنے کا جہاں مطالبہ کیا ہے، وہ اس طرح کیا ہے جیسے کہ وہ کتاب لکھی ہوئی صورت میں ایک ترتیب کے ساتھ موجود ہے۔

قُلْ فَأْتُوْا بِالتَّوْرٰةِ فَاتْلُوْهَا اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. (آل عمران: ۳، ۹۱)

ترجمہ: ''اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ پھر تورات لاؤ پھر اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۔''

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ. فَأْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. (الصّٰفّٰت ۳۰: ۱۵۶، ۱۵۷)

ترجمہ: ''کیا تمہارے پاس کوئی واضح دلیل موجود ہے؟ اگر تم سچے ہو تو اپنی کتاب پیش کرو۔''

اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ. (القلم ۶۰: ۷۳)

ترجمہ: ''کیا تمہارے پاس کوئی آسمانی کتاب ہے جس میں یہ پڑھتے ہو۔''

یہ تمام ناقابل انکار شہادتیں ہیں کہ سابقہ کتب سماویہ لکھی جاتی تھیں اور کتابی شکل وصورت میں موجود تھیں تو کیا صرف قرآن حکیم ہی اس سے مستثنٰی تھا جس کی جمع، ترتیب، تشریح اور حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا۔

قرآن حکیم کی سورۂ نحل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک مکتوب کا بھی

---

[1] تاج العروس [2] انکشاف جلد دوم۔ معالم التنزیل جلد سوم

Marfat.com

ذکر ہے جو انہوں نے ہُد ہُد کے ذریعے ملکہ سبا کو بھیجا تھا جب یہ خط ملکہ سبا کو ملا تو اس نے اس خط کا مضمون پڑھ کر اپنے اہل دربار کو سنایا۔

قرآن پاک نے سورہ جمعہ میں ان لوگوں کیلئے جن کو کتاب الٰہی دی گئی لیکن انہوں نے اس کے احکام پر عمل نہ کیا، یہ مثال دی ہے کہ:

كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا. (الجمعہ :۶۲:۵)

ترجمہ: ''ان کی مثال ایک گدھے کی سی ہے جس کے اوپر کتابیں لادگئی دی ہوں۔''

یہاں بھی اسفاراً سے مراد لکھی ہوئی کتابیں ہیں جو کہ اوراق پر مشتمل مدون صورت میں ہوں، جنہیں کسی جانور کی پیٹھ پر لادا جاسکے۔

اوپر کی تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ قرآن حکیم موجودہ ترتیب کے ساتھ کتابی شکل میں رسول کریم ﷺ کی زندگی مرتب ہو گیا تھا۔

وَلَقَدْ فَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّكُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ. (القصص:۲۸:۵۱)

ترجمہ: ''اور ہم نے لوگوں کے لئے قرآن مجید کو نظم [1] کے ساتھ مرتبط رکھتے ہوئے ترتیب دیدیا ہے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

چنانچہ حضور ﷺ کی زندگی میں صحابہ کرامؓ کے پاس قرآن حکیم کے بعض اجزاء لکھے ہوئے موجود تھے)

(۱) حضرت علیؓ (۲) حضرت عثمانؓ (۳) حضرت عبداللہؓ بن مسعود (۴) حضرت عبداللہؓ بن عمر بن عاص (۵) حضرت سالم مولیٰ حذیفہؓ (۶) حضرت زیدؓ بن ثابت (۷) حضرت معاذؓ بن جبل (۸) حضرت ابیؓ ابن کعب (۹) حضرت ابوزیدؓ بن قیس الشکن رضی اللہ عنہم۔

مندرجہ ذیل حضرات کو عہد نبوت میں ہی سارا قرآن مجید موجودہ ترتیب کے ساتھ حفظ تھا۔

---

[1] بیضاوی

Marfat.com

(۱) حضرت عبداللہؓ بن مسعود (۲) حضرت سالم مولیٰ حذیفہؓ (۳) حضرت معاذؓ بن جبل (۴) حضرت ابیؓ ابن کعب (۵) حضرت زیدؓ بن ثابت (٦) حضرت ابوزیدؓ (۷) حضرت ابوؓالدرداء[۱] رضی اللہ علیہم۔

امامیہ کے اکابر علما کی تصریحات:

امامیہ کی نسبت مشہور ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کا کچھ حصہ غائب کر دیا گیا تو یہ بات ان کے اکابر علماء کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔ سید مرتضیٰ شیخ الطائفہ محمد بن حسن طبری، ابوعلی طبری صاحب جمع البیان، محمد بن بابویہ قمی سب نے اس لغویات کی شدت سے تردید کی ہے محمد بن علی بن بابویہ قمی لکھتے ہیں:

"واعتقادنا ان القرآن الذین انزل اللہ علی نبیہ ھومابین الدفتین ومافی ایدی الناس لیس اکثرمن ذلک ومن نسب الینا نقول انہ من ذلک فھو کاذب"۔

ترجمہ: "ہمارا عقیدہ ہے کہ جو قرآن اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم پر اتارا، بعینہ وہی قرآن ہے جو اُمت کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ قرآن مجید اس سے زیادہ ایک حرف نہیں تھا۔ جو شخص ہماری طرف منسوب کرتا ہے کہ ہم قرآن مجید کے اس سے زیادہ ہونے کے قائل ہیں وہ جھوٹا ہے۔[۲]

سید مرتضیٰ حسن کہتے ہیں:

"امامیہ اور حشویہ میں سے جن لوگوں نے اس بارہ میں اختلاف کیا ہے۔ ان کے اختلاف کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ ان کے سارے اختلافات کا مدار اصحاب روایات کی چند ضعیف روایات پر ہے جن کو یہ حضرات صحیح سمجھتے ہیں حالانکہ ان روایات کی یہ حیثیت نہیں کہ ان کی بنیاد پر ایک ایسی بات سے انکار کر دیا جائے جس کی صحت قطعیت کے ساتھ معلوم ہے۔"

---

[۱] آخری تین حضرات کاتبان وحی میں سے ہیں۔ [۲] کتاب الاعتقادات

Marfat.com

علامہ ابوعلی طبری لکھتے ہیں:-

ومن ذلک الکلام فی زیادة القرآن ونقعسانه وانه یتعلق بالتفسیر فاما الزیادة فجمع علی بطلا نه.[1]

ترجمہ: ''ان ہی میں سے ایک بحث یہ ہے کہ قرآن مجید کی زیادتی یا کمی ہوئی یا نہیں۔ یہ بحث فن تفسیر سے متعلق ہے۔ یہ امر کہ قرآن میں کچھ زیادتی ہوئی ہے، سب کے نزدیک باطل ہے۔''

قاضی نوراللہ شوستری فرماتے ہیں:-

مانسب الی شیعة الامامیه بوقوت التفسیر فی القرآن لیس من ماقال ب جمهور الامامیه انما قال به شرزمة قلیلة الااعتدادبهم فیما بینهم.[2]

ترجمہ: ''شیعہ امامیہ کی طرف یہ بات جو منسوب کی گئی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں تغیر ہوا ہے جمہور امامیہ اس کے قائل نہیں ہیں۔ اس کا قائل ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو کسی شمار میں نہیں۔''

شیخ حُر عاملی رسالہ تواتر قرآن میں لکھتے ہیں:

من تبع الاخبار فی تصفح الاثار من کتب الاحادیث والتواریخ غیر ذلک فانه یعلم قطعاً ان القرآن کان لی غایة الکشرة نقله من الناقلین اکثر منهم دانه، مازال یزید وقد تقدمه فی کلام المرتضیٰ انه کان مجموعاً مرتبا علیٰ عهه رسول الله صلعم،

ترجمہ: ''آثار واخبار اور تاریخ وحدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ قرآن حکیم کثرت سے نقل ہوتا رہا ہے اور حضرت علی مرتضیٰ کے کلام سے یہ بات ثابت ہے کہ قرآن حکیم حضور سرور عالم ﷺ کے زمانے میں جمع و مرتب ہو چکا تھا۔''

شیخ حُر عاملی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جس کلام کا حوالہ دیا ہے وہ اصل کلام یہ ہے:

---

[1] تفسیر مجمع البیان طبع ایران جلد اول

[2] مصائب النوائب

Marfat.com

ان القرآن كان على عهد رسول الله صلعم مجموعاً مرلفاً على ماهو عليه الان وكان يدرس وخيفظ جميعه فى ذلك الزمان وانه كان يعرض على النبى وتيلىٰ عليه وان جماعته من الصحابه كعبد الله بن مسعود وابى بن كعب وغيرهم حتم القرآن على النبى صلعم عدة ختمات وكل ذلك باونى تامل يدل علىٰ انه كان مجموعاً مرتباً غير منشور لامبثوث.

ترجمہ: ”بے شک قرآن حکیم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جمع اور مرتب ہو چکا تھا جیسا کہ وہ آج کل ہے۔ اور اس زمانے میں سب اسے پڑھتے تھے اور حفظ کرتے تھے جس طرح اب یاد کرتے ہیں اور مشہور صحابہ کرام مثلاً عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب وغیرہ حضور اقدس ﷺ کے سامنے تلاوت کرتے تھے اور ختم کرتے تھے اور یہ بات ادنیٰ تامل سے معلوم ہو سکتی ہے کہ قرآن حکیم حضور ﷺ کے زمانے میں جمع و مرتب ہو چکا تھا۔ منتشر اور ادھر ادھر بکھری ہوئی حالت میں نہ تھا۔“[1]

غرضیکہ آئمہ و مجتہدین کرام نے اپنی تحریرات میں ایسے ہی بیان لکھے ہیں جن کو اگر یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم جلد مرتب ہو سکتی ہے۔ ان تحریرات کے مقابلے میں صاحب ”اصول کافی“ اور ان کے ہم مشرب گنتی کے دو ایک افراد کی کوئی حیثیت نہیں۔

---

[1] حضرت علیؓ کے الفاظ مجموعاً و مرتباً (جمع مرتب حالت میں) غیر منشور و غیر مبثوث (جو منتشر حالت میں ادھر ادھر بکھرا ہوا نہ ہو، قابل توجہ ہیں۔ جو لوگ قرآن حکیم کو عہد نبوت میں محض ہڈیوں اور کھجور کے پتوں وغیرہ پر لکھا ہوا منتشر اور متفرق اجزا کی صورت میں ادھر ادھر بکھرا ہوا خیال کرتے ہیں وہ اس عظیم خارجی شہادت پر غور کریں۔ قرآن حکیم کی داخلی شہادت پہلے گذر چکی ہے کہ قرآن حکیم عہد نبوت میں ہی جمع و مرتب، غیر مبثوث شکل میں موجود تھا۔ جو کتاب کا مصنف ہوتا ہے جمع و ترتیب بھی وہی کر سکتا ہے۔ قرآن حکیم کو نازل کرنے والی ہستی ہی اس جامع (جمع و ترتیب دینے والی) ہے۔ اس لئے جامع القرآن اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات ہے۔ حضرت عثمانؓ جامع القرآن نہیں تھے ان کو ناشر القرآن کہا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

تفکر فی القرآن کے اساسی اصول

قرآن حکیم میں تدبر و تفکر کرنے کیلئے مفسرین نے باضابطہ اصول متعین نہیں کئے۔ اس ضمن میں ترجمان القرآن علامہ ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ نے کوشش فرمائی ہے۔ لیکن چند قاعدے لکھ کر انہوں نے اس کام کو نامکمل چھوڑ دیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی اپنے رسالہ ''نورالکبیر'' میں اس سلسلے میں ایک ناتمام کوشش کی ہے۔ علامہ غفاری لکھتے ہیں کہ علم تفسیر میں بجز چند معمولی قاعدوں کے اصول مطلقاً وضع نہیں کئے گئے جن پر اس کی جزئیات کا مدار ہو۔

ا۔ تفسیر آیات بالآیات:۔

علامہ سیوطیؒ ''اتقان'' میں لکھتے ہیں:۔

قال العلماء من اراد تفسیر الکتاب العزیز طلبه اولاً من القرآن فما اجمل منه فی مکان فقد فسرنی موضع اخروما اختصر فی مکان نقد بسط فی موضع اخرمنه وقد الف ابن الجوزی کتاباً فیما اجمل فی القرآن ونسرنی موضع اخر منه اشرت الی امثله منه فی نوع الجمل.

''علماء نے کہا ہے کہ جو شخص کتاب عزیز کی تفسیر کرنا چاہے اس کو چاہئیے کہ وہ سب سے پہلے قرآن کی تفسیر قرآن سے کرے۔ قرآن میں جو چیز ایک جگہ مجمل ہے، وہی چیز دوسری جگہ شرح وبسط کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ ابن جوزی نے خالص اس عنوان پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں قرآن کے ان مطالب سے بحث کی ہے جو ایک جگہ مجمل ہیں اور دوسری جگہ مفصل۔ میں نے مجمل کے باب میں اس کی بعض مثالوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔''

Marfat.com

قرآن حکیم اس طرح کی تفسیر کو تصریف آیات کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے یعنی قرآن میں آیات مختلف طریقوں سے الٹ پھیر کر بیان کی گئی ہیں۔ قرآن اپنے آپ کو کتاباً متشابھاً کہتا ہے یعنی ایسی کتاب جس کے بعض حصوں کے مضامین دوسرے حصوں کے مضامین سے ملتے جلتے ہیں۔ ایک ایک مضمون کو کئی طرح پیش کیا گیا ہے۔ میر انیس کہتے ہیں۔

گلدستۂ معنٰی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں　　اک پھول کا مضموں ہو سو رنگ سے باندھوں

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ. (انعام: ۶: ۱۰۵)

ترجمہ: "اور دیکھو اس طرح ہم گوناگوں طریقوں سے آیتیں بیان کرتے ہیں تاکہ وہ لوگ بول اٹھیں۔ تم نے (بیان حق میں کوئی کمی نہیں کی سب کچھ) پڑھ سنایا۔ نیز اس لئے کہ ہم اہل علم کیلئے تشریح کر دیں۔"

اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ. (انعام ۶: ۶۵)

ترجمہ: "سو دیکھو! کس طرح ہم گوناگوں طریقوں سے انہیں بیان کرتے ہیں تاکہ (لوگ) سمجھیں بوجھیں۔"

بعض مفسرین نے اپنی کتابوں کی بناء روایات پر رکھی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت امام احمد ابن حنبل رحمتہ اللہ علیہ کا قول پہلے نقل ہو چکا ہے۔ جس میں انہوں نے فرمایا کہ تفسیر روایت کی کوئی اصل نہیں۔ [1]

قرآن حکیم کے الفاظ کی حکومت قائم رہنی چاہیے:-

قرآن حکیم ایسی وحی نہیں جو صرف مفہوم کے اعتبار سے وحی ہو بلکہ اس کے الفاظ وحی ہیں۔ اسلیئے اس کے الفاظ میں قطعیت ہے، جامعیت ہے، وسعت و گہرائی ہے۔ ایسی وسعت و گہرائی جس کے آگے سمندروں کی وسعتیں اور گہرائیاں بھی ہیچ ہیں۔

---

[1] تفسیری روایات میں ایسی روایات بھی ہیں جو علم، عقل اور قرآن کے خلاف ہیں۔ ان کی مثالیں اپنے اپنے مقام پر آ رہی ہیں۔

Marfat.com

غوّاص محبت کا اللہ نگہباں ہو — ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

اسلئے قرآن حکیم کی آیات کی تشریح وتاویل کرتے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ قرآن حکیم کے الفاظ کی حکومت قائم رہنی چاہئے۔ روایات اس طریقہ سے نہ لی جائیں جس سے قرآن کے الفاظ کا فیصلہ باطل ہو جائے۔ الفاظ کی قطعیت ہر حال میں قائم رہنی چاہئے۔ اصل چیز قرآن کے اپنے الفاظ اور اس کی توضیحات ہیں۔ احادیث جو لائی جائیں وہ صحیح ہوں۔ صحیح حدیث قرآن کے فہم میں معاون ثابت ہوگی۔ لیکن اصل چیز قرآن ہے۔ علامہ حمید الدین فراہیؒ تفسیر کے خبری ماخذ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''بعض ماخذ اصل واساس کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض نوع کی۔ اصل واساس کی حیثیت تو صرف قرآن کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کسی چیز کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ باقی فرع کی حیثیت سے تین ہیں۔''

(۱) احادیث (۲) قوموں کے ثابت شدہ اور متفق علیہ حالات (۳) گذشتہ انبیاء کے صحیفے جو محفوظ ہیں۔

اگر[1] احادیث، تاریخ اور قدیم صحیفوں میں ظن اور شبہ کو دخل نہ ہوتا تو ہم ان کو فرع کے درجہ میں نہ رکھتے۔ بلکہ سب کی حیثیت اصل کی قرار پاتی اور سب بلا اختلاف ایک دوسرے کی تائید کرتے۔ پس جو شخص قرآن کو سمجھنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ روایات کے ذخیرہ میں سے ان روایات کو نہ لے جو اصل کو ڈھانے والی ہیں۔ بعض روایتیں ایسی ہیں کہ اگر ان کی تاویل نہ کی جائے تو ان کی زد براہ راست اصل پر پڑتی ہے اور ان کا سلسلہ نظم درہم برہم ہو جاتا ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ بہت سے لوگ آیت کی تاویل تو کر ڈالتے ہیں لیکن روایت کی تاویل کی جرأت نہیں کرتے بلکہ بسا اوقات تو صرف آیت کی تاویل ہی پر بس نہیں کرتے بلکہ اس کے نظام کی بھی قطع و برید کر ڈالتے ہیں۔ حالانکہ جب اصل وفرع میں تعارض ہو تو کاٹنے کی چیز فرع ہے نہ کہ اصل۔

---

[1] اقتباس جاری ہے۔

Marfat.com

وکان رائینا من فروع طویلة　　تمـموت اذا لم یحتهن اصول

ترجمہ: ''اور کتنی دراز شاخیں ہم نے دیکھی ہیں کہ جب جڑیں ان کو غذا نہیں پہنچاتیں تو وہ سوکھ کر رہ جاتی ہیں۔''

اور سب سے زیادہ تعجب ان لوگوں پر ہے جو ایسی روایتیں تک قبول کر لیتے ہیں جو مخصوص قرآن کی تکذیب کرتی ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جھوٹ بولنے کی روایت یا آنحضرت ﷺ کے خلاف وحی۔ قرآن پڑھنے کی روایت۔ اس طرح کی روایات کے بارے میں ہم کو نہایت محتاط ہونا چاہیئے۔ صرف وہ روایتیں قبول کرنی چاہیں جو قرآن کی تصدیق و تائید کریں.......... یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن مجید اپنی تفسیر کے لئے ان فروع کا محتاج نہیں ہے۔ وہ تمام کتابوں کے لئے خود مرکز و مرجع کی حیثیت رکھتا ہے اور جہاں کہیں اختلاف واقع ہو تو اس کی روشنی جھگڑے کو چکانے والی بنے گی۔ لیکن اگر تم کو قرآن مجید کی تصدیق و تائید کی ضرورت ہو تو ان فروع کی مراجعت سے تمہارے ایمان و اطمینان میں اضافہ ہوگا.......... ایک اور قابل لحاظ حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم سے جو کچھ ثابت ہو اس میں اور فروع سے جو کچھ معلوم ہو، اس میں فرق کرنا چاہئے۔ دونو کر غلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ قرآن میں جو کچھ ہے وہ قطعی ثابت ہے اور فروع میں وہم و ظن کیلئے بہت کچھ گنجائش ہے۔ پس اگر کوئی شخص فروع میں سے کسی بات کا منکر ہو تو وہ قرآن کے منکر کی طرح نہیں ہوسکتا۔ اِسی طرح یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ خبر اگر چہ متواتر ہو، قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ اس کی یا تو تاویل کریں گے یا اس میں توقف کریں گے۔ لیکن اس کی خاطر قرآن کو منسوخ نہیں کریں گے۔ امام شافعیؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ اور عام اہل حدیث، حدیث کو قرآن کا ناسخ نہیں مانتے، اگر چہ حدیث متواتر ہی کیوں نہ ہو۔ پس یہ آئمہ حدیث، جو حدیث کے معاملہ میں صاحب البیت (گھر کے بھیدی) کی حیثیت رکھتے ہیں، اس بات کے قائل نہیں ہوئے تو اس بارے میں ہم فقہاء و متکلمین کی رائے کو کوئی وزن نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اس فتنہ سے امان میں رکھے کہ ہم اس بات کے قائل ہوں کہ کوئی رسول اللہ ﷺ کے کلام کو منسوخ کر سکتا ہے۔[1]

---

[1] مقدمہ نظام القرآن

Marfat.com

۲۔ تفسیر آیات بالعلم:-

کائنات خدا کا فعل (Work) ہے اور قرآن خدا کا قول (Word)۔ اللہ کے فعل اور قول میں کوئی اختلاف یا تضاد یا تناقض ممکن ہی نہیں۔ اس لئے کائنات میں جو کچھ واقع ہوتا ہے اور جن اصول وقوانین کے تحت ہوتا ہے، وہ قرآن کے بیان کردہ اصول وقوانین کے خلاف نہیں ہوتے اور قرآن میں جو اصول وقوانین بیان کئے گئے ہیں، کائنات میں ان کے خلاف واقع نہیں ہوتا۔ کائناتی اصول وقوانین اور قرآنی اصول وقوانین کے مابین ایک مستقل ہم آہنگی اور لاینفک باہمی مطابقت موجود ہے۔

ہست قرآں سر بسر گفتار حق — نیز عالم جملگی کردارِ حق
کے بود کردار و گفتار خدا — ہم چو قول ما ز فعل ما جُدا

ترجمہ: ''قرآن پاک سربسر گفتار حق Word of Allah اور دنیا و عالم کی تمام اشیاء کردار حق Action of Allah یا پھر فعل حق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کردار، اس کی گفتار سے الگ کیسے ہوسکتا ہے؟ جیسے ہمارا قول ہمارے فعل سے جدا ہوتا ہے۔''

قرآن اور کائنات کا چونکہ مصنف ایک ہی ہے اسلئے وہ اپنی ایک کتاب سے دوسری کتاب میں جگہ جگہ استدلال و استشہا کا کام لیتا ہے۔ قرآن حکیم میں جسے کتاب مبین کہا گیا ہے۔ وہی چیز ہے جو واضح ہے، روشن ہے، ظاہر ہے اور کھلی ہوئی ہے۔ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتَابِ الْمُبِیْنَ (شعرا ۲۶ : ۲) یہ آیات ظاہر اور واضح کتاب کی ہیں۔ یہی آیت سورہ شعراء، سورہ یوسف اور سورۃ قصص کے زیب عنوان بھی ہے۔ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتَابِ الْمُبِیْنَ (یوسف ۱۲ : ۱) (قصص ۲۸ : ۲) سورۃ حجر کے شروع میں قُرْاٰنٍ مُّبِیْنَ کے الفاظ ہیں۔ تِلْکَ اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ وَالْکِتَابِ مُّبِیْنَ (حجر ۱۵) یہ آیات الٰہی اس الکتاب کی ہیں جو قانون خدا ہے اور اس قرآن کو جو ہر طرح واضح اور روشن ہے۔ سورۃ نمل کِتَابِ مُّبِیْنَ کے الفاظ میں تِلْکَ اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ

Marfat.com

وَ کِتَـابٍ مُّبِیۡنٍ (النمل ۲۷:۱) یہ آیات الٰہی قرآن کریم کی ہیں اوراس کتاب کی جو واضح اور روشن ہے۔ سورۃ یوسف میں ہے:

تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ. (یوسف ۱۲:۱۔۲)

ترجمہ: ''اے لوگو! یہ آیت الٰہی جلیل القدر کتاب کی ہیں جو روشن اور واضح ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس کتاب مبین کو اپنے ہاں سے عربی زبان کا لباس پہنا کر عربی اللسان قرآن اس لئے بنایا ہے تاکہ تم لوگ اس کے اسرار و رموز کو پا کر عقلمند بن جاؤ۔''

نیز سورۃ زخرف میں فرمایا:

وَالۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ. اِنَّا جَعَلۡنٰہُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ. وَاِنَّہٗ فِیۡۤ اُمِّ الۡکِتٰبِ لَدَیۡنَا لَعَلِیٌّ حَکِیۡمٌ. اَفَنَضۡرِبُ عَنۡکُمُ الذِّکۡرَ صَفۡحًا اَنۡ کُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّسۡرِفِیۡنَ. (الزخرف ۴۳:۲ تا ۵)

ترجمہ: ''لوگو! کتاب مبین اس امر کی شاہد ہے کہ ہم نے قرآن کو عربی زبان میں اس لئے نازل کر دیا ہے تاکہ تم لوگ اس کے اسرار و رموز اُمّ کو بآسانی سمجھ سکو اور یہی قرآن (جس کو تمہارے سمجھانے کے لئے عربی لباس پہنایا گیا ہے) اس ام الکتاب کا حصہ ہے جو ہمارے پاس ہے اور جو ایک مقتدر اور مخزن حکمت کتاب ہے۔ تو کیا اس وجہ سے کہ تم لوگ اس کتاب کے حقیقی مقاصد نہ سمجھنے میں حد سے بڑھے ہوئے ہو اور ہمارے مطلب کو نہیں پاتے۔ ہم اس کتاب کے مطالب کو تم سے سرتاسر اس طرح اُچک لیں کہ تم خاک بھی نہ سمجھ سکو۔[1]

اوپر کی ہر دو آیات میں کسی روشن اور بیّن (اَلۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ) کی شہادت پیش کی گئی ہے اور اَنۡزَلۡنٰہُ (۱۲:۲) اور جَعَلۡنٰہُ (۴۳:۲) کی ضمائر ھُو کا مرجع بھی کتاب مبین کی طرف ہے۔ گویا اللہ تعالےٰ نے کسی کتاب مبین کو شاہد بنا کر یہ کہا ہے کہ ہم نے کتاب مبین کو عربی زبان کا لباس پہنا کر عربی قرآن اس لئے بنا دیا تاکہ تم اس کے راز دروں کو سمجھ سکو۔

---

[1] آج اس آیت جلیلہ کی رو سے مسلمانوں کی مُسرفین قوم سے کتاب خدا کے مطالب اچک لئے گئے ہیں۔

Marfat.com

ان آیات کے ساتھ ان آیات کو بھی آپ سامنے رکھیں جن کا ذکر ان سے پہلے کیا گیا ہے۔یعنی تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ (۱:۱۵) اور تِلْکَ اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ (۱:۲۸) یہاں اَلْکِتٰبِ اور قُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ (۱:۱۵) اور اَلْقُرْاٰن اور کِتَابٍ مُّبِیْنٍ (۱:۲۷) کے درمیان ظاہری مناسبت قائم کر کے کتاب فطرت اور کتاب الٰہی کو دو علیحدہ علیحدہ چیزیں بیان کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی معنی خیز اشارہ کر دیا ہے کہ دونوں (کتاب فطرت اور کتاب الٰہی) ایک ہیں۔

ان آیات (زخرف ۴۲:۲۔۵) اُمِّ الْکِتَاب سے مراد علم الٰہی ہے۔گویا کائنات خدا کا فعل ہے۔قرآن خدا کا عمل ہے اور اُمِّ الْکِتَاب اللہ کا علم ہے۔یہ تینوں ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کرتی ہیں۔ایک دوسرے کی تبیین و تشریح میں معاون ہیں۔ اسلئے فطرت کا علم جتنا زیادہ ہوتا ہے۔قرآن حکیم کی آیات کے حقائق و معارف زیادہ مشرّح ہوتے جاتے ہیں۔سورہ اعراف میں ہے:-

وَلَقَدْ جِئْنٰا هُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ. (اعراف : ۵۲)

ترجمہ:''ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جس کی تفصیل علم کے ساتھ کی ہے۔''

سورۃ القائم میں فرمایا:

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ. (العالم : ۹۸)

ترجمہ:''ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کیلئے کی ہے جو سمجھ اور فہم رکھتے ہیں۔''

علم کی قرآنی حکیمانہ تعریف ''علم بالحواس'' کے عنوان کے تحت پہلے گذر چکی ہے کہ ''علم سمع، بصر اور فواد (ذہن) کے ذریعے حاصل ہونے والے حقائق کا نام ہے۔ یعنی جس کا انحصار تجربہ و مشاہدہ اور ان سے حاصل شدہ حقائق کے عقلی استنباط پر ہو۔اس سلسلے میں سورہ فاطر کی آیات (۲۷:۲۸) پیش نظر رہیں جن میں ''علماء'' کا لفظ استعمال کر کے یہ حقیقت آشکار کر دی کہ کن کن اور کس طرح کے حقائق کا علم رکھنے والے ''علماء'' کہلانے کے مستحق ہیں اور کیونکر ان میں خشیت الٰہی پیدا ہوسکتی ہے۔فرمایا:

Marfat.com

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِّيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ. وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ. (فاطر ۳۵:۲۷،۲۸) اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً. (۳۵:۲۷)

ترجمہ: ''کیا تم نے اس امر کا اپنی جسمانی آنکھوں سے بچشم خود مشاہدہ و تجزیہ کر کے غور نہیں کیا (اَلَمْ تَرَ) کہ اللہ نے بادلوں سے پانی برسایا فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا. (۳۵:۲۷) پھر ہم نے اس کے ذریعے سے انواع واقسام اور مختلف رنگوں کے پھل نکالے وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ. (۳۵:۲۷) اور اسی طرح پہاڑوں کے سرخ وسفید طبقات ہیں جن کے رنگ اور اقسام مختلف ہیں اور ان میں سے بعض بجھنگ کالے[1] ہیں۔ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ. (۳۵:۲۸) اور اسی طرح انسانوں اور دیگر جانداروں اور مویشیوں کی بھی مختلف رنگتیں اور مختلف اقسام ہیں۔

ان آیات میں کائنات کے مختلف شعبوں کا ذکر کیا ہے جن میں ہم فضائیات (Metreology) علم طبیعیات (Physics) اور علم کیمیا (Chemistry) علم نباتات (Botany) علم طبقات الارض (Geology) اور علم الجبال (Petrology) علم الحیوانات (Zoology) علم الانسان (Anthropology) کے شعبوں میں مشاہدے، غور وفکر اور استنباط نتائج کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا. (۳۵:۲۸) اور بے شک اللہ سے صرف ان لوگوں کے بدن میں خوف پیدا ہوسکتا ہے، صرف انہی کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوسکتے ہیں، صرف انہی کے دل لرز سکتے ہیں اور کپکپا جاتے ہیں جو ان بیان کردہ

---

[1] ان میں معدنی کوئلے کی طرف اشارہ ہے جس پر آج ترقی یافتہ اقوام کے تمکن فی الارض کا اکثر انحصار ہے نیز اس کی مزید تشریح کے لئے دیکھو صفحہ ۹۴ [2] مغفرت کے معنے محافظت کے ہیں۔ غفور کے معنی ہوئے محافظت کرنے والا۔

Marfat.com

حقائق کا علم رکھتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ. (۲۸:۳۵) اور یہ حقیقت منکشف ہو کر ان کے سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑی زبردست اور غالب قوتوں والا ہے اور کائنات کو تکوینی طور پر ہر قسم کے تخریبی عوامل واثرات سے محفوظ رکھ کر اس کو کمال کی طرف لے جارہا ہے۔

ان آیات جلیلہ کی رو سے علماء وہ لوگ ہیں جو کائنات کے مختلف شعبوں میں مشاہدہ و مطالعہ کے ذریعے ان میں غور وفکر کر کے حقائق معلوم کرتے ہیں۔ فطرت کے یہ معلوم کردہ حقائق، قرآنی حقائق کی تائید وتصدیق کرتے ہیں، ان کی وضاحت، تبیین اور تشریح کرتے ہیں۔

قرآن حکیم میں دو قسم کے امور پائے جاتے ہیں ایک امور شرعیہ واعتقادیہ اور دوسرے امور اخباریہ۔ امور اخباریہ تاریخی اور علمی حقائق پر مشتمل ہیں۔ علمی حقائق سے مراد طبیعیاتی (Physical) حیاتیاتی (Biological) اور نفسیاتی (Psychological) حقائق ہیں۔ جہاں تک امور شرعیہ واعتقادیہ کا تعلق ہے، وہ ہر زمانے میں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ان میں سلف کے فہم پر اعتماد بھی کیا جاسکتا ہے اور اسے ترجیح بھی دی جاسکتی ہے۔ لیکن جہاں تک تاریخی، طبیعیاتی، حیاتیاتی اور نفسیاتی حقائق کا تعلق ہے، نئے حقائق کا اضافہ ہوسکتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اسلیئے ان امور سے متعلقہ آیات کی تشریح اس زمانہ کی علمی سطح کے مطابق ہوتی ہے۔ جوں جوں اعمال الٰہی کا علم اور فطرت کائنات کا مشاہدہ وسیع ہوتا جائے گا، قرآن حکیم کی آیات زیادہ بیّن اور مشرّح ہوتی جائیں گی۔ ایسے حالات میں قدیم مفسرین سے اختلاف کرنا قابل اعتراض نہیں ہوسکتا۔ ظاہر ہے کہ علم الاشیاء کے متعلق انسان کی واقفیت جتنی بڑھے گی، قرآن کے اس طرح کے بیانات کا مطلب پہلے سے زیادہ صحیح طریقے سے سمجھ میں آتا چلا جائے گا، یہ کوئی احکام شرعیہ اور امور اعتقادیہ نہیں ہیں جن میں سلف کا فہم زیادہ معتبر ہو۔[1]

---

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودی ترجمان القرآن رجب شعبان ۱۳۷۱ھ بمطابق اپریل، مئی ۱۹۵۲ء بحوالہ رسائل ومسائل حصہ دوم۔

Marfat.com

یہی مطلب ہے سورۃ قیامۃ کی اس آیت کا کہ:

اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ. ترجمہ: ''قرآن کی تشریح ہمارے ہی ذمہ ہے۔'' (القیمۃ: ۱۹)

یعنی ہر زمانے کا علم اس کی تشریح کرتا چلا جائے گا۔ دوسری جگہ فرمایا:

سَنُرِیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ ؕ (حٰمٓ سجدہ ۴۱: ۵۳)

ترجمہ: ''ہم ان کو اپنی آیات خارجی کائنات (آفاق) اور ان کے اپنے اندر (نفس) دکھائیں گے یہاں تک کہ یہ بات نکھر کر ان کے سامنے آجائے گی کہ قرآن فی الواقعہ ایک حقیقت ثابتہ ہے۔''

زندگی جہد است استحقاق نیست ٭ جُز بعلمِ انفس و آفاق نیست (اقبالؒ)

''زندگی جدّ و جہد کا نام ہے اس پر انسان کا استحقاق (Privilige) نہیں۔ دراصل زندگی صرف انفس و آفاق کے علوم پر مشتمل ہے؟ گویا انسان کا فریضہ یہی ہے کہ وہ یہ علوم حاصل کرے۔ (دیباچہ پیام مشرق)

عالم آفاق اور عالم انفس کی آیات سے مراد طبیعاتی، حیاتیاتی اور نفسیاتی حقائق ہیں جو زمانہ کے پیچ و خم میں لپٹے ہوئے ہیں اور علم و تحقیق کے ذریعے کھلتے جائیں گے اور قرآن کے حقائق عالی ایک ایک کر کے ثابت ہوتے جائیں گے۔

آں کتاب زندہ قرآن حکیم ٭ حکمت او لا یزال است و قدیم
حرف اورا ریب نے تبدیل نے ٭ آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
صد جہان تازہ در آیات اوست ٭ عصرہا پیچیدہ در آنات اوست
یک جہانش عصر حاضر را بس است ٭ گیر گر در سینہ دل معنی رس است [1]

---

[1] درس کے آخر میں یہ سوال کیا گیا تھا کہ رسول کریم ﷺ مستقبل کے علمی حقائق سے آگاہ تھے؟ اس کا یہ جواب دیا گیا۔ رسول کریم کیا ہر نبی ان سے آگاہ ہوتا ہے۔ خدائے عالم الغیب والشہادہ ہر نبی کو محسوس بلکہ ماورائے محسوس حقائق کا مشاہدہ کرا دیتا ہے۔ جن امور و حقائق پر ہمارا ایمان بالغیب ہوتا ہے نبی کا ایمان بالشہود ہوتا ہے۔ حضرت نبی کریم ﷺ نے ایسے امور کی تفصیلات و جزئیات اسلئے نہ بتائیں کہ زمانے کی علمی سطح اس کا تقاضا نہ کرتی تھی۔ اگر آپؐ ایسے علمی حقائق کی تشریح فرما

Marfat.com

علامہ اقبالؒ نے رُموزِ بے خودی میں ''قرآن آئین ملت محمدیہ'' کے عنوان کے تحت فرمایا ہے کہ ''قرآن حکیم'' کتاب زندہ ہے (اور اسرارِ حیات پر مبنی ہے)

''اس کی حکمت قدیم بھی اور کبھی نہ ختم ہونے والی ہے گویا اِسے کبھی زوال نہیں آئے گا۔ یہ ہر عہد اور ہر زمانے میں تروتازہ رہے گی۔ اس کے حروف والفاظ میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں اور نہ ہی اس کی آیات تبدیل ہوئی ہیں اور نہ کبھی تبدیل ہوں گی۔ اس کی آیات مبارکہ واضح اور روشن ہیں اور ان کیلئے کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں قرآن پاک کی دو آیات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ پہلی آیت لَا رَیْبَ فِیْهِ ہے اور دوسری لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰهِ ہے۔ پہلی آیت کا ترجمہ ہے کہ ''اس میں کوئی شک نہیں'' اور دوسری کے معنی ہیں کہ ''اللہ کے کلمات تبدیل نہیں ہوسکتے۔''

اس کا ایک جہان ہی عصر حاضر کیلئے کافی ہے۔ اگر تیرے سینہ میں حقیقت تک پہنچنے والا دل موجود ہے تو اس کتاب حکیم سے کچھ حاصل کر لے۔'' (ترجمہ سعید بدر)

۳۔ قرآن میں نظم اور ربط:-

قرآن ایک منظم اور مربوط کلام ہے۔ لیکن مفسرین نے (سوائے چند علماء) کے اس پہلو کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ علامہ سیوطیؒ ''اتقان'' میں لکھتے ہیں:

''ابو حیان کے شیخ علامہ ابو جعفر بن زبیر نے خاص، اس عنوان پر ایک کتاب تالیف کی ہے۔ اس کا نام ''البرہان فی مناسبۃ سور القرآن ہے۔ ہمارے ہم عصروں

دیتے تو زمانہ کی علمی سطح چونکہ بلند نہ تھی لوگ اُلجھنوں میں پڑ جاتے اور دعوتِ حق کا اصل مقصد و مدعا فوت ہو جاتا۔ احکام شرعیہ اور امور اعتقادیہ کی طرف کوئی توجہ نہ کرتا۔ ایمان کی طرف جو دعوت دی گئی تھی اُس میں مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ اسلئے آپ نے تکلم الناس علی قدر عقولهم کے پیش نظر ان حقائق کی تشریح خود نہ فرمائی بلکہ آنے والے زمانے پر چھوڑ دیا کہ ہر زمانے کا علم بتدریج ان حقائق سے نقاب کشائی کرتا جائے گا۔ جب تک علم گواہی نہ دے انسانی عقل تکذیب کرتی رہتی ہے۔ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ (یونس ۱۰: ۳۸) اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے اُس کو جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیق سفر نے انہیں کہہ دیا تھا کہ وَ كَيْفَ تصار علی سالم (الکھف ۱۸:۶۸) بھلا ایسے اس پر آپ کیسے صبر کر سکیں گے؟ جو آپ کے احاطہ واقفیت سے باہر ہیں۔

Marfat.com

میں سے شیخ برہان الدین بقاعی نے بھی اپنی کتاب نظم ''الدّ ارنی تناسب الآنی والسور'' میں نظم کو خاص طور پر پیش کیا ہے۔''

امام سیوطیؒ نے خود بھی نظم قرآن کے سلسلے میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:۔

''پہلے شخص جنہوں نے علم مناسبت (علم نظم) کو ظاہر کیا شیخ ابوبکر نیشاپوری ہیں۔ فقہ و ادب میں ان کا بڑا مرتبہ تھا۔ ان کے لئے منبر رکھا جاتا جس پر بیٹھ کر وہ قرآن کی آیتوں کی شرح کرتے اور بتاتے کہ فلاں آیت، فلاں آیت کے پہلو میں کیوں رکھی گئی اور فلاں سورۃ فلاں سورۃ کے ساتھ رکھنے میں کیا حکمت ہے؟ اور علمائے بغداد کی تنقیص کرتے کہ یہ لوگ نظم کے علم سے بالکل محروم ہیں۔''

امام سیوطیؒ نے ابن عربی کا مندرجہ ذیل قول بھی نقل کیا ہے:۔

''آیات قرآن کے باہمی تعلق کو اس طرح سمجھنا کہ وہ ایک مسلسل اور مربوط کلام کے قالب میں ڈھل جائیں، ایک عظیم الشان علم ہے۔ صرف ایک عالم ہی اس سے تعرض کیا ہے۔ اس اصول پر اس نے پوری سورۃ بقرہ کو منظم کر دیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے ہم پر یہ دروازہ کھولا۔ لیکن ہم نے لوگوں کے اندر اس علم کے قدردان نہیں پائے۔ ساری دنیا دُوں ہمتوں اور کاہلوں سے بھری ہوئی ہے۔ پس ہم نے اس کو مہر بند ہی رکھا اور اپنے اور اپنے خدا کے درمیان اس معاملہ کو اسی کی طرف لوٹا دیا۔''

یہی حال امام فخر الدین رازی رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

''قرآن حکمت کا ایک بڑا حصہ ترتیب و نظم میں چھپا ہے۔''

مخدوم ومہائمیؒ کی تفسیر کا موضوع ہی نظم ہے۔ ان کی تفسیر کا نام ''تبصیر الرحمٰن وتیسّر المنان'' ہے۔

شیخ ولی الدین علومی لکھتے ہیں:۔

''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیتوں میں اس لئے نظم نہیں تلاش کرنا چاہیئے کہ وہ مختلف وقتوں میں مختلف حالات کے ماتحت نازل ہوئی ہیں، وہ غلط کہتے ہیں۔ ٹھیک بات یہ ہے کہ

Marfat.com

نزول کے پہلو سے تو واقعات کے لحاظ سے ہیں لیکن ترتیب کے پہلو بالکل مطابق حکمت ہیں:-

ہمارے زمانے میں نظم قرآن کے پر زور مفسر اور داعی علامہ حمید الدین فراہی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ ان کی تفسیر کا نام ہی ''نظام القرآن'' ہے۔ قرآن کے طالب علم کیلئے یہ تفسیر کئی پہلوؤں سے ایک نہایت مفید تفسیر ہے۔ بعض مفسرین نظم قرآن کے قائل نہیں۔ یہ خود ان کی اپنی کمزوری ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نظم کا دعویٰ کریں اور نظم معلوم نہ کر سکیں، تو یہ بات ان کے خلاف پڑتی ہے۔ بات بالکل صاف ہے کہ اگر نظم نہ ہوتا تو قرآن کی موجودہ ترتیب نہ ہوتی۔ پھر ترتیب نزولی ہی رہتی۔ قرآن کی تقسیم سورتوں میں ہے۔ قرآن نے اپنی مثل بنانے کا جو چیلنج کیا ہے اس چیلنج میں دس سورتیں یا ایک سورت لانے کو کہا گیا ہے۔ ایک سے کم سورۃ کو پیش نہیں کیا گیا۔ یہ اس لئے کہ ہر سورت کا ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے جسے سورۃ کا **عمود** کہتے ہیں۔ تمام سورۃ ایک حکیمانہ ترتیب سے اس **عمود** سے متعلق ہوتی ہے۔ ہر سورۃ کے اندر **نظم و ترتیب** موجود ہے۔ ہر سورۃ ایک **منظّم کلام** ہے۔ ہر سورۃ ایک **نظمی وحدت** ہے جس میں **تمہید** **خاتمہ** اور **عمود** ہوتا ہے۔ ربط و نظام کے محاسن کے لحاظ سے چھوٹی اور بڑی سورتیں ایک جیسی ہیں۔ ''تفسیر آیات بالعلم'' کے عنوان کے تحت یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن صحیفہ فطرت ہے۔ ایک عامی کے لئے فطرت کے اندر کوئی ربط موجود نہیں۔ لیکن فطرت کے ایک طالب علم کو فطرت میں نظم، ربط اور ایک معنوی وحدت دکھائی دیتی ہے۔ آج ثابت ہو چکا ہے کہ مکھی اور پھول میں ربط ہے۔ آگ اور پانی میں ربط، سورج اور شکر میں ربط ہے۔ صوت (Sound) اور نور (Light) میں ربط ہے، کوئلے اور باجے کی لے ایک ہے۔ بجلی کی سناہٹ اور شمع کی روشنی ایک ہے، بجلی کی چمک اور کڑک ایک ہے۔ فطرت کا پرامن، متعاون اور مربوط ہونا خدا کے واحد ہونے کی دلیل ہے۔ فطرت کے معنوی ربط کی طرح قرآن میں بھی معنوی ربط ہے لیکن تنگ اور بے علم نگاہیں اس نظم و ربط کو نہیں دیکھ سکتیں۔ اس لئے جو تفسیریں اس نظم و ربط کو نظر انداز

Marfat.com

کر کے لکھی گئی ہے۔ ان میں قدم قدم پر اختلاف پیدا ہے۔ قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کے خلاف صف آرا ہے، بات بات پر تفرق ظاہر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قرآن کا بھیجنے والا خدا الگ ہے بلکہ ہر سورۃ اور ہر آیت کا خدا الگ ہے۔ جس کا نتیجہ ذہنی انتشار ہے۔ قرآن کا ظاہری اقرار لیکن باطنی انکار ہے۔

۴۔ شان نزول کی حقیقت:۔

شان نزول کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ کوئی خاص واقعہ کسی آیت یا سورۃ کے نزول کا سبب بنا ہے۔ یہ غلط تصور ہے جو کہ نظم قرآن کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ نظم کلام تسلسل کو چاہتا ہے اور ہر آیت کا کسی خاص واقعہ سے متعلق ہونا تسلسل کے منافی ہے۔ شان نزول کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں۔

''دانستہ شود کہ اکثر اسباب نزول در فہم معانی آیات دخل ندارد۔ اللّٰھم لا شے قلیل وآنچہ محمد ابن اسحاق کلبی دریں باب افراط کردند اندر وزیر ہر آیتے قصہ آوردہ اند نزدیک محدثین اکثر غیر صحیح است و دراسناد آں نظر است۔ آں را شرط تفسیر دانستن خطائے بین است و بر حفظ آں تدبر کتابت اللہ را موقوف داشتن حظ خود را از کتاب الہ فوت کردن است[1]

ترجمہ: ''یہ بات جاننے کی ہے کہ شان نزول کے بڑے حصے کو آیات قرآن کے سمجھنے میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کا کارآمد حصہ بہت تھوڑا ہے اور یہ محمد ابن اسحٰق کلبی نے جو اس باب میں زیادتی کی ہے اور ہر آیت کے تحت ایک قصہ نقل کر دیا ہے۔ اس کا بڑا حصہ محدثین کے نزدیک غیر صحیح اور اس کے اسناد محل نظر ہیں۔ اس کو شرط تفسیر جاننا سخت غلطی ہے اور کتاب الٰہی کے تدبر کو اس پر موقوف رکھنا اپنے آپ کو کتاب الٰہی سے محروم کرنا ہے۔''

---

[1] فوز الکبیر

Marfat.com

سلف کے نزدیک شان نزول کا یہ مفہوم نہیں تھا۔ علامہ زرکشی "برہان" میں لکھتے ہیں:

"قد عرف من عادة الصحابة و التابعين ان احدهم اذا قال نزلت هذه الايث في كذافانه يريد بذلك انما ينضمن هذا الحكم لا ان هذا كان السبب في نزولها جنس الاستدلال عي الحكم لامن جنس النقل الهاوقع."

ترجمہ: "صحابہ و تابعین کا یہ طریقہ عام ہے کہ ان میں سے جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ یہ آیت فلاں بارہ میں نازل ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں اس بات کا بھی حکم موجود ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ یہ بات اس کے نزول کا سبب ہے۔ گویا یہ اس آیت سے اس معاملہ پر ایک استدلال ہوتا ہے نہ کہ نقل واقعہ۔"

صرف ان واقعات کا جاننا ضروری ہے جن کی طرف آیات قرآنی اشارہ کر رہی ہوں۔

۵۔ محکمات و متشابہات:۔

تفسیر آیات بالعلم کے ضمن میں کہا گیا تھا کہ تاریخی، طبیعاتی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم سے مزید حقائق معرض وجود میں آتے رہیں گے اور قرآن حکیم کی ان حقائق سے متعلقہ آیات کا مطلب پہلے سے زیادہ صحیح طریقہ پر سمجھ میں آتا چلا جائے گا۔ لیکن ہمارا علم ابھی تک ارتقاء کے مراحل میں ہے۔ تو پھر ان آیات کے متعلق ہمارا کیا رویہ ہونا چاہیئے جن کے متعلقہ شعبہ علم کی واقفیت ابھی اس حد تک نہ پہنچی ہو کہ آیات کو زیادہ صحیح طریقہ پر سمجھنے میں مدد دے۔ ایک آیت کے مختلف مطالب و مفاہیم تو نہیں ہو سکتے۔ ہر آیت واحد المعانی ہے، محکم اور اٹل ہے، نا قابل بدل اور ناممکن التحریف ہے، مقرر اور متعین شے ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ پہلے کوئی اور مفہوم لیا جائے بعد میں کوئی اور مفہوم۔ اسلئے قرآن حکیم نے اپنی آیات میں محکمات اور متشابہات کی ایک اصولی تمیز قائم کر دی ہے کہ ارتقاء کے علم کے مختلف منازل میں بعض آیات متشابہ المعانی ہوں گی اور اس سے بادی النظر میں کچھ اور مفہوم نکل سکے گا اور جب تک انسان کا علم ایک

Marfat.com

خاص سطح بلند تک نہ پہنچے گا ان کے صحیح مطالب معلوم نہیں ہو سکتے، ان کے متعلق رویہ یہ ہو کہ ان آیات کو سچا مان کر ان میں اختلاف نہ پیدا کیا جائے۔ ان کے سمجھنے کی خاطر اعمال خدا اور صحیفہ کائنات کے مطالعہ کو اور وسیع کرتے رہنا چاہیئے۔ آخر کار علم کے باعث حقیقت منکشف ہو کر رہے گی اور وہ آیات متشابہات کی فہرست سے نکل کر محکمات کی فہرست میں آجائیں گی۔ مثلاً قرآن زمین اور دوسرے اجرام فلکی کو متحرک قرار دیتا ہے۔ لیکن اگر کسی زمانے کا علم سورج کو ساکن ٹھہراتا ہے تو قرآن حکیم میں وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا۔ [۲] (یٰسٓ ۳۶: ۳۸) کی آیت اس زمانے کی متشابہات میں سے ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کے ماننے والوں کا فرض ہے کہ سورج کے کسی مستقر کی طرف حرکت کے سلسلے میں شب و روز مشاہدے کریں خواہ اس میں صدیاں ہی کیوں نہ گذر جائیں۔ ناقابل انکار معلومات فراہم کریں جس سے قرآن کے نظریے کی تصدیق ہو۔ چنانچہ اس نظریہ کی تصدیق ہرچیز نے کی کہ سورج مع اپنے نظام شمسی کے ایک مجامع النجوم کی طرف جا رہا ہے جسے ویگا کہتے ہیں۔ اب یہ آیت محکمات میں داخل ہو گئی۔ یہی رویہ ہمارا ان تمام آیات کے متعلق ہونا چاہیئے جنہیں ہم اپنے کمی عمل کے باعث نہیں سمجھ سکے۔

---

[۱] هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ. فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ م وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ. رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً. اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. رَبَّنَاۤ اِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ. (ال عمران ۳: ۷.۹)

اے پیغمبر! اللہ تو صاحب فضل و کرم اللہ ہے جس نے تمھیں یہ قانون دیا۔ اس میں بعض آیات اپنے مطالب میں محکم ہیں اور یہی قانون خدا کی اصل و اساس ہیں اور بعض (بادی النظر میں) متشابہ المطالب۔ تو جن لوگوں کے دلوں میں (کمی علم کے باعث کجی اور کم بینی ہے تو وہ فساد کرانے یا اختلاف کھڑا کرانے کی غرض سے (ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ) یا کم از کم اصل مقصود کی تلاش میں (وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ) ان آیتوں کے پیچھے، اپنے علم و ترقی کیے بغیر لگے رہتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کے سوائے ان کے اصل مقصود (تاویلہ) کا علم کسی کو نہیں ہوتا۔ البتہ جو لوگ علم میں بڑی دسترس رکھتے ہیں (وہ جب ان آیات کے صحیح مقاصد کو نہیں پہنچ سکتے تو کہہ دیتے ہیں) کہ ہمارا ان کے سچ ہونے پر پورا یقین ہے۔ اگر صحیح مطالب معلوم نہیں۔ سب ہمارے اللہ کی طرف

Marfat.com

۶۔ قرآنی لغت:۔

انسانی لغت تغیر پذیر ہوتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ماہرین لغت اپنے خاص زمانے کو مدنظر رکھ کر رائج الوقت معانی کو مرتب کر کے لغت تیار کرتے ہیں۔ پھر جوں جوں انسانی اعمال اور محسوسات میں تغیر آ جاتا ہے، الفاظ کے پہلے متعین کردہ معانی بدلتے جاتے ہیں۔ کسی زمانے کی بنائی ہوئی لغت صرف اس زمانے کے مروجہ معانی کی سند ہو سکتی ہے۔ قبل اور مابعد کے زمانے کیلئے اسے حکم نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ مرور وقت کے باعث بہت سے الفاظ متروک الاستعمال ہو جاتے ہیں یا اگر الفاظ قائم رہیں تو ان کا اساسی سے ملتے ہیں۔ ولی وکنی کے وقت کی جو اردو ہے اس کا مابعد زمانے کی اردو اور پھر آج

سے ہیں جس کا علم تمام عالم پر حاوی ہے اور قرآن حکیم سے وہی اشخاص مستقل نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ یَذَّکَّرُ جو ارباب علم و دانش ہیں (یہی وہ لوگ ہیں جو علم کی خاموش سعی وتلاش کے ہر مرحلے میں پکارتے ہیں) کہ ہمارے پروردگار! تو راہ دِکھلا پیچھے ہمارے دِلوں کو قرآن کے متعلق کج بینی کی طرف مائل نہ کر اور اپنی سرکار سے ہم کو علم عطا کر کہ یہ تیری بڑی رحمت ہے۔ بے شک تو بڑا ہی بخشش کرنے والا ہے، اے ہمارے پروردگار! یہ روز قیامت کو جس کے واقع ہونے میں کوئی بھی شک نہیں سب لوگوں کو اکٹھا (کر کے ان سے ان کے خلاف کے متعلق باز پُرس) کرنے والا ہے۔ (سو ہم کو توفیق دے کہ تیری آیات بینات سے متعلق کوئی اختلاف پیدا کرنے کا باعث ہوں اور متحد العمل بنے رہیں) اِس میں شک نہیں کہ تو اپنے وعدوں کے خلاف نہیں کرتا اور یہ پرسش ضرور کر کے رہے گا۔

اس آیہ کا ترجمہ متن کی عبارت کے مفہوم کو پیشِ نظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ عام طور پر مشابہات سے وہ آیات مراد لی جاتی ہیں جو ماورائے محسوس ومعقول حقائق متعلق ہوں یا اُن کے بیان کرنے کا پیرایہ خاص اختیار کیا گیا ہو لیکن میری دانست میں یہ صحیح نہیں۔ ایسی آیات کو جو ماورائے محسوس ومعقول سے متعلق ہیں اُن کے پیرایۂ بیان کو متشابہات میں شمار کر کے اس طرح محکمات کی فہرست سے نکال لینا اُن کو کتاب الٰہی کی اصل واساس (اُم الکتاب) نہ بنانے کے مترادف ہے حالانکہ ماورائے محسوس ومعقول حقائق ہی کتاب اللہ کی اصل واساس ہیں۔ یہ حقائق ایمانیات اور متعلقات ایمانیات پر مشتمل ہیں۔ ایمان کی طرف دعوت تمام قرآنی تعلیمات کا اصل مقصود ومدعا ہے۔ ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت تمام قرآن کی دعوت کا خلاصہ ہے۔ یہ کتاب اللہ کی اصل واساس ہیں۔ باقی سب احکام واصول کا انحصار ان پر ہے۔ قرآن کی اصل اساس دوسرے معنوں میں اُم الکتب ہونے کی حیثیت سے یہ محکمات میں شامل ہیں۔ یہ حقائق خلاف عقل (Contra Rational) نہیں، اِن سب کی بنیاد عقل پر ہے۔ ان کے پیرایۂ بیان میں بھی کوئی ایسی بات نہیں جو بعید از عقل ہو۔ متشابہات کی فہرست میں ایسی آیات ہیں جو کتاب اللہ کی اصل واساس نہیں۔ یہ صرف وہی ہو سکتی ہیں جو امور اعتقادیہ اور احکام شریعہ سے متعلق نہ ہوں۔ دوسرے معنوں میں جو امور اخباریہ سے متعلق ہوں اور زمانہ اپنی علمی سطح کے مطابق اُن کی تشریح کرتا جائے۔ ۲ سورج اپنے مستقر کی طرف جا رہا ہے۔ ۳ ہم نے قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

Marfat.com

مفہوم جُزاً یا کُلًّا محرّف ہوجاتا ہے۔ ہر زبان کی لغت میں ایسے الفاظ کثرت کی اردو سے مقابلہ کیجئے۔ شیکسپیئر نے اپنے ڈراموں میں بعض الفاظ کا جو مفہوم لیا تھا، ان الفاظ کا آج وہ مفہوم نہیں ہے۔ یہ معنوی انقلاب قرآن کے الفاظ میں بھی پیدا ہوتا رہا ہے جو کہ مسلمانوں کے حسیات کے ہبوط کی تاریخ کو پیش کر رہا ہے۔ ایمان، شرک، کُفر، تقویٰ، اصلاح، صبر، توکل، ظلم، فسق وغیرہ بیسیوں الفاظ ایسے ہیں جن کا مفہوم جزءیا کلیۃ مسخ ہو چکا ہے۔ لیکن قرآن حکیم کے اندر ان کا صحیح مفہوم موجود و محفوظ ہے۔ قرآن نے ان الفاظ کو زبان عرب سے لیا اور ہر لفظ کے متعلق ایک مستقل مفہوم مدنظر رکھ کر خاص اصطلاح وضع کی۔ پھر اس مفہوم کی تلقین رسول اللہ ﷺ سے کرا کر ایک خاص ماحول پیدا کیا۔ اس طرح الفاظ کا الٰہی مفہوم قرآن کے اندر ہمیشہ کیلئے محفوظ کر لیا گیا۔ اس لحاظ سے قرآن تغیر پذیر لغت سے بے نیاز ہے۔ اس کے نہ صرف الفاظ بلکہ ان الفاظ کا مفہوم بھی انسانی دستبرد سے محفوظ کر دیا گیا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ۔ ۳ (الحجر ۱۵:۹) کا وعدہ نہ صرف الفاظ قرآن کے متعلق ہے بلکہ ان الفاظ کے مفہوم کے متعلق بھی ہے۔ ہر لفظ کے صحیح واحد معنی قرآن کے اندر موجود و محفوظ ہیں۔ ایک ایک لفظ کی شرح اس کے اوراق کے اندر ہے۔ قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی، اور ایک جز دوسرے جز کی نمایاں تائید اور کامل تفسیر کر رہا ہے۔ انسانی لغت کی تغیر پذیرائی کا اس پر کچھ اثر نہیں ہو سکتا اور نہ زمان و مکان کے خارجی اثرات یا کوئی مکرر تاویل اور قیاس ورائے اس کے مطالب کو متاثر کر سکتے ہیں۔ اس کے کلمات صدق اور عدل پر ختم ہو چکے ہیں۔

تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ۔ (انعام ۶ : ۱۱۵)

ترجمہ: ''اے پیغمبر ﷺ! تمہارے پروردگار کے سب کلمات اس کتاب میں صدق و عدل پر ختم ہو گئے ہیں اور اس کے کلمات کے صدق و عدل کو کوئی خارجی طاقت بدل نہیں سکتی۔''

Marfat.com

۷۔قرآن اور حدیث:۔

قرآن فہمی کے سلسلے میں حدیث سے افراط وتفریط سے کام لیا گیا ہے۔ کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو احادیث وآثار کو قرآن پر حاکم بنا دیتے ہیں۔ وہ قرآن کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں اور حدیث کی شان میں بھی کچھ اضافہ نہیں کرتے۔ اس کے ردعمل سے دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو حدیث کا انکار کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ علم وحکمت کے ایک حصہ سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ تفسیری روایات کی کوئی اصل نہیں اور حدیث قرآن کی ناسخ بھی نہیں ہوسکتی۔ لیکن صحیح حدیث کے اندر ایک ایسا خزانہ موجود ہے کہ اگر ہم ان کو لیں تو قرآن کی آیات کے مطالب ومفہوم کے سمجھنے میں بڑا معاون وثابت ہوتا۔ خود مہبط وحی کی زبان اقدس سے قرآن حکیم کی تعلیمات کا ماحصل اس طرح پر پیش کیا گیا ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس کو پیش ہی نہیں کر سکتا۔ قرآن کے بعض الفاظ ایسے ہیں جن کے اصطلاحی مفہوم کو ہم اس وقت پیش کر سکے جب کہ ہم نے ان قرآنی الفاظ کا استعمال حدیث میں دیکھا۔ ایسے بے شمار الفاظ آج کل زبان زد خواص وعوام ہیں۔ نمونے کے طور پر ایک صحیح حدیث پیش کی جاتی ہے۔ جماعتی نظام کی تشکیل کا جو تصور قرآن میں موجود ہے اگر اس قسم کی احادیث ہمارے سامنے نہ ہوتیں تو ہم نہ تو "امیر جماعت" کا تصور کر سکتے، نہ سمع کی اصطلاح کا مفہوم ومطلب سمجھ میں آتا اور نہ ہی طاعت کا۔ اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ صحیح حدیث کی قدر وقیمت کا۔ اس حدیث کا ترجمہ وتشریح زمانہ حاضرہ کے ایک عبقری[۱] (Genius) کے قلم سے پڑھیئے اور فکر کو روشن کیجئے۔

قال صلے الله عليه وسلم . انا امركم نجمس . الله امرنى بهن: الجماعته السمع، والطاعته، والهجرة، والجهاد فى سبيل الله. فانه من خرج من الجماعته قيد شبر، نقد خلع ربقة الاسلام من عنقه الان

---

[۱] ابوالکلام رحمۃ اللہ علیہ

Marfat.com

يـراجـع ، ومـن وعابد عرى جاهلية فهو من حتى جهنم. قالوا يارسول الـلـه وان صـام وصـلى؟ قال وان صلى وصام وزعم انه مسلمٌ اخرجه احـمـد والـحـاكـم من حـديـث'' الحديـث الاشعرى على شـرط الصحيحين. قال ابن كثير هذا حديث حسن وله الشواهد.

ترجمہ: ''یعنی فرمایا رسول اللہ ﷺ! میں تم کو پانچ باتوں کیلئے حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے دیا ہے جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہو تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ لوگوں نے عرض کیا۔ کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا اگر چہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو؟ فرمایا ہاں اگر چہ روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو، اور اپنے زعم میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔''

اس حدیث میں پانچ باتیں بتلائی ہیں۔

(۱) پہلی چیز ''جماعت'' ہے۔ یعنی تمام امت کو ایک خلیفہ وامام پر جمع ہو کر اور اپنے مرکز قومی سے جڑ کے رہنا چاہیے۔ الگ الگ نہیں رہنا چاہیئے۔ آگے چل کر کثرت کے ساتھ وہ حدیثیں ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ جماعت سے الگ ہو کر رہنے کو یا ایسی منتشر زندگی کو جو ایک بندھی اور سمٹی ہوئی جماعت کی شکل نہ رکھتی ہو اور کسی امیر کے تابع نہ ہو، اسلام نے غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے۔ انفرادی زندگی کو وہ زندگی ہی نہیں مانتا۔ اسلامی زندگی ''جماعت'' ہے۔

''جماعت'' سے مقصود افراد کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں اتحاد، ائتلاف، امتزاج اور نظم ہو۔

''اتحاد'' سے مقصد یہ ہے کہ اپنے اعمال حیات میں منتشر نہ ہوں۔ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں اور ان کے تمام اعمال مل جل کر انجام پائیں۔ کسی گوشۂ عمل میں بھی پھوٹ اور بیگانگی نہ ہو۔

Marfat.com

''ائتلاف'' کا مرتبہ ''اتحاد'' سے بلند ہے۔ ''اتحاد'' صرف باہم مل جانا ہے۔ ضرور نہیں کہ کسی تناسب کے ساتھ ترکیب ہوئی ہو لیکن ''ائتلاف'' سے مقصود ایسا اتحاد ہے جو محض اتحاد ہی نہ ہو بلکہ ایک صحیح و مناسب ترکیب کے ساتھ اتحاد ہو یعنی منتشر افراد اس طرح باہم ملے ہوں کہ جس فرد کو اس کی صلاحیت و قوت کے مطابق جو جگہ ملنی چاہئے، وہی جگہ اسے ملی ہو اور ہر فرد کی انفرادی قوت کو جماعتی ترکیب میں اتنا ہی دخل دیا جائے، جتنی مقدار میں دخل پانے کی اس میں استعداد ہو۔ ایسا نہ ہو کہ زید کو سردار ہونا چاہیئے اور اس سے چاکری کا کام لیا جائے اور عمر کی قابلیت کا عنصر صرف چھٹانک بھر جزو جماعت ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کو سیر بھر قرار دے دیا جائے۔

''امتزاج'' ترکیب کا تیسرا مرتبہ ہے۔ اس میں کمیت سے زیادہ کیفیت کا اتحاد ہونا چاہیئے۔ یعنی مختلف افراد کو باہم اس طرح ملایا جائے کہ جس فرد کا اجتماعی مزاج جس قسم کے مزاج کے ساتھ مل کر ایک متحد کیفیت حاصل کر سکتا ہے، ویسا ہی مزاج اس کے ساتھ ملایا جائے۔ یہ نہ ہو کہ دو ایسے آدمیوں کو ملایا گیا ہو جن کی طبیعت و خصلت اور استعداد و صلاحیت باہم دگر میل نہیں کھا سکتی اور اس لئے خواہ کتنا ہی دونوں کو ملاؤ لیکن تیل اور پانی کی طرح ہمیشہ الگ الگ ہی نظر آئیں، باہم مل کر ایک جان نہ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح عناصر کو اسلیئے پیدا کیا ہے کہ باہمد گر مل کر ایک نئے مرکب وجود میں متشکل ہوں۔ اسی طرح افراد انسانی کو بھی اسلیئے پیدا کیا تا کہ اس کے باہم ملنے سے جماعت پیدا ہو۔ ''جماعت'' ایک مرکب وجود ہے۔ افراد اس کے عناصر ہیں۔ فرد بجائے خود کوئی کامل وجود نہیں رکھتا۔ محض ایک شئی ہے اور جب تک اپنے بقیہ ٹکڑوں سے مل نہ جائے کامل وجود نہیں پا سکتا۔ لیکن یہ باہم ملنا ''امتزاج'' کے ساتھ ہونا چاہیئے تا کہ ہر ٹکڑا اپنے صحیح و مناسب ٹکڑے کے ساتھ مل کر اس طرح جڑ جائے کہ معلوم ہو یہ نگینہ اسی انگشتری کیلیئے تھا۔

''نظم'' سے مقصود جماعت کی وہ ترتیبی و تقویمی حالت ہے جب اس کے تمام

Marfat.com

افراد اپنی اپنی جگہوں میں قائم، اپنے اپنے دائرہ میں محدود اور اپنے اپنے فرائض و اعمال کے انجام دینے میں سرگرم ہوں۔

اجتماع کے یہ خواص و اوصاف نہ تو حاصل ہو سکتے ہیں، نہ قائم رہ سکتے ہیں، جب تک کوئی بالاتر فعال و مدبر طاقت وجود میں نہ آئے اور وہ منتشر افراد کو ایک متحد اور مؤتلف ممزوج اور منظّم جماعت کی شکل میں قائم نہ رکھے۔ پس ایک ''امام'' کا وجود ناگزیز ہوا اور اسی لئے ضروری ہوا کہ سب سے پہلے تمام افراد ایک ایسے وجود کو اپنا امام ومُطاع تسلیم کرلیں جو بکھرے ہوئے اجزا کو اتحاد و ائتلاف اور امتزاج ونظم کے ساتھ جوڑ دینے اور اڑتے ہوئے ذروں سے ایک حیّ و قائم جماعتی وجود پیدا کر دینے کی قابلیت رکھتا ہو۔ اصل مرکز اس طاقت کا امام اعظم یعنی خلیفہ ہے اور پھر ہر ملک، ہر آبادی، ہر گروہ میں اس کے تحت امام جماعت ہونے چاہئیں۔ مسلمانوں کے کسی چھوٹے سے چھوٹے گروہ کے لئے بھی شرعاً جائز نہیں کہ بلا قیام امام کے زندگی بسر کریں حتی کہ اگر صرف تین مسلمان بھی ہوں، تو چاہیئے کہ ایک ان میں سے ایک امام تسلیم کرلیا جائے ''اذا كان ثلاثة في سفر فليومر و ااحدهم'' ترجمہ: ''اگر تین آدمی سفر میں شامل ہوں تو آپس میں سے ایک کو امام بنالو۔'' (حدیث نبوی ﷺ)

پانچ وقت کی جماعت نماز میں جماعتی نظام کا پورا پورا نمونہ مسلمانوں کو دکھلایا گیا۔ کیونکہ نماز ہی وہ عمل عظیم ہے جو اسلام کے تمام عقائد و اعمال کا جامع ترین نمونہ ہے۔ کس طرح سینکڑوں ہزاروں منتشر افراد مختلف مقاموں، مختلف جہتوں اور مختلف لباس میں آتے ہیں، لیکن یکا یک صدائے تکبیر سب کے انتشار کو ایک کامل اتحادی جسم میں تبدیل کر دیتی ہے یہاں تک کہ ہزاروں اجزاء کا یہ منتشر مواد بالکل ایک جسم واحد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سب کے وجود ایک ہی صف میں جڑے ہوئے، سب کے کاندھے ایک دوسرے سے ملے ہوئے، سب کے قدم ایک ہی سیدھ میں۔ سب کے چہرے ایک ہی جانب، قیام کی حالت ہے تو سب ایک جسم واحد کی طرح

Marfat.com

کھڑے ہیں، جھکاؤ ہے تو تمام صفیں بہ یک وقت جھکی ہوئی ہیں۔ ظاہر کے ساتھ باطن بھی یکسر متحد و ممزوج، سب کے دل ایک ہی کی یاد میں محو، سب کی زبانیں ایک ہی کے ذکر میں مترنم، پھر دیکھو سب کے آگے صرف ایک ہی وجود امام کا نظر آتا ہے۔ جس کے اختیار میں جماعت کے تمام اعمال وافعال کی باگ ہوتی ہے۔ جب چاہے سب کو جھکادے، جب چاہے سب کو اٹھادے۔

اسلام کی زبان میں "جماعت" سے مقصود ایسا اجتماع ہے۔ انبوہ اور بھیڑ کا نام جماعت نہیں ہے۔

جماعت کے جن اوصاف وخواص کا اوپر ذکر کیا گیا، وہ تمام تر قرآن وسنت سے ماخوذ ہیں لیکن شواہد کی تفصیل کا یہ موقع نہیں

(۲) دوسری چیز "السمع" ہے۔ یعنی امام جو احکام دے۔ اس کو سننا، اور اس سے تعلیم واشارہ حاصل کرنا۔ "سمع" کے لفظ میں قبولیت احکام طلب وتعلیم، دونوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور امام کی معلمانہ حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔

(۳) تیسری چیز "اطاعت" ہے۔ یعنی امام کی کامل درجہ اطاعت وفرمانبرداری اور اپنی تمام عملی قوتوں کو اس کے سپرد کردینا اور اس کے ہر حکم کی بلاچون وچرا تعمیل کرنا البتہ اطاعت معروف ہے۔ نہ کہ معصیت میں کہ "انما الطاعته فی المعروف."

(۴) چوتھی بات "ہجرت" ہے۔ ہجرت ہجر سے ہے جس کے معنی ترک کردینے اور چھوڑ دینے کے ہیں۔ الھجر والھجران مفارقة الا انسان غیرہ ، اما بعد بالبدن او باللسان اوبالقلب والمھاجرہ. معارمة الغیر ومتارکة (۵۵۷)

اسلام کی اصطلاح میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت سعادت وصداقت کے کسی مقصد اعلیٰ کے لیے اپنی دُنیوی محبوبات و مالوفات ترک کردے۔ مثلاً دولت کو، آرام و راحت کو، اعزہ واقراب کے قرب کو، وطن ومکان کو، تو اس کا نام ہجرت الی اللہ اور ذہاب الی اللہ ہے۔ خدا کے ہر رُسول اور ان کے پیروؤں کو قیام حق کی راہ میں یہ

Marfat.com

منزل طے کرنی پڑی۔اِنّی مھاجر الی ربی اور انی ذاھب الی ربی. چونکہ وطن ومکان کا علاقہ ایک ایسا علاقہ ہے جس کے ترک کرنے میں اہل وعیال، مال ومتاع، دوست واحباب، ہر طرح کے علاقوں کو ترک کردینا پڑتا ہے اور اس کی محبت و الفت کی زنجیر اور ساری زنجیروں سے بھاری ہے، اسلئے ترک وطن کی ہجرۃ اعلیٰ اور جامع قسم کی ہجرت ہوئی اور زیادہ تر مہاجرت کا اطلاق تارکین وطن ہی پر کیا گیا۔

ولکل امری مانوی. فمن کانت ھجرته الی الله ورسوله فھجرته الی الله ورسوله ومن کانت ھجرته لدنیا یصیبھا او امراۃ یتزوجھا فھجرته الی ماھا جر الیه. (بخاری عن عمر)

ترجمہ:''یعنی ہر شخص کے لئے وہ ہے جس کی اس نے نیت کی۔پس جس نے اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اور اس کے رسول کے لئے ہوئی، اور جس نے اس لئے گھر چھوڑا کہ دنیا کمائے یا نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی کام کے لئے ہوئی جس کے لئے اس نے گھر چھوڑا۔''

پھر ہجرت کے بھی اقسام ہیں اور مراتب بعنہا فوق بعض کتاب وسنت اس کی تفصیل سے لبریز ہیں۔یہ موقعہ تفصیل کا نہیں۔

پانچویں چیز ''جہاد فی سبیل اللہ'' ہے۔''جہاد'' جہد سے ہے جس کے معنی استفراغ الوسع فی مدافعته العدو ظاھراً و باطناً ہیں (مفروات راغب) یعنی دشمن اور دشمن کی تمام قوتوں کو دور کرنے اور اپنے کو قائم وباقی رکھنے کے لئے انتہا درجہ کی کوشش کرنا، یہ کوشش زبان سے بھی ہوتی ہے، مال سے بھی ہوتی ہے، جان سے بھی ہوتی ہے، جس قسم کی کوشش کی ضرورت ہو۔ ہر قسم جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔''وجاھدوا المشرکین بامرالکم وانفسکم والسنتکم. (رواہ ابو داؤد، واحمد، ونسائی، و ابن حبان، عن انس)

یہ کہنا ضروری نہیں کہ یہی پانچ چیزیں دنیا میں قوموں اور ملکوں کے بقاء وقیام کی

Marfat.com

اصلی بنیاد ہیں۔ دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جس کی قومی ہستی ان پانچ عنصروں سے مرکب نہ ہو۔ سعی وعمل کا کوئی گوشہ ہو، کامیابی بغیر ان اصول خمسہ کے نہیں مل سکتی۔ تم مٹھی بھر گیہوں کے طالب ہو یا قطب شمال کی تحقیق کے۔ مگر کوئی چیز بھی جماعت، اطاعت، ہجرت اور جہاد کے حاصل نہ ہو سکے گی۔ دنیا نے آج تک جو کچھ پایا ہے، غور کرو گے تو وہ سب ان ہی پانچ سچائیوں کے ثمرات ونتائج ہیں۔

دنیا کے تمام نزاعات واختلافات کی ایک سب سے بڑی علت حقیقت کی وحدت اور اسماء مصطلحات کی کثرت ہے۔ طلب کے اکثر جھگڑے حکایت شہد وعسل سے زیادہ نہیں۔ یعنی سچائی ہر جگہ اور ہر گوشہ عمل میں حقیقت ومسمٰی کے اعتبار سے ایک ہی ہے، لیکن بھیس مختلف ہو گئے ہیں اور نام متعدد، مصیبت یہ ہے کہ دنیا معانی کی جگہ لفظوں کی پرستش کرتی ہے، اور اگرچہ سب طلب گار و پرستار ایک ہی حقیقت کے ہیں لیکن محض ناموں کے اختلاف کی وجہ سے باہمد گر لڑ رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے شہد، دوسرا کہتا ہے عسل۔ مگر کوئی نہیں جو دونوں کو سمجھا دے کہ مقصود دونوں کا ایک ہے۔ اختلاف مسمیٰ میں نہیں صرف اسم میں ہے۔ ایک شخص شب وروز ایک حقیقت کو مانتا اور جانتا ہے لیکن اپنی اصطلاح ورسم میں کسی خاص لقب سے پکارتا ہے۔ وہی حقیقت جب ایک دوسرے نام سے اس کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو فوراً انکار کر دیتا ہے اور اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اس سے ہر طرح نفرت کرے۔ مذاہب کے اختلاف سے لے کر معاشرت ورسوم کے چھوٹے چھوٹے اختلافات تک، ہر جگہ ہی علت کام کر رہی ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو سکے کہ ظواہر واسماء کے تمام پردے اٹھا دیئے جائیں اور حقیقت بے نقاب ہو کر سب کے سامنے آجائے، تو یکایک دنیا کے تمام نزاعات ختم ہو جائیں اور تمام لڑنے والے دیکھ لیں کہ سب کا مطلب ایک ہی ہے اگرچہ بھیس مختلف ہے اور سب کا مقصد ایک ہی ہے اگرچہ نام بہت سے ہیں۔

عباراتنا شتیٰ وحسنک واحد وکل الیٰ ذالک الجمال یشیر!

Marfat.com

علوم وحقائق کے مشاہدہ مناظر میں مشہد سب سے اعلیٰ وارفع مقام رکھتا ہے۔ اسی کو شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ ''علم الجمع بین المختلفات'' سے تعبیر کرتے ہیں۔[1] اور عامۂ اصحاب اشارات وسلوک نے ''مشہد وحدت'' کی اصطلاح اختیار کی ہے جو سالک طریق کیلئے کشف حجب اور سیر حقائق کا سب سے بلند تر مقام ہے۔ مقصود اس سے وہ قوت نظر وفکر ہے جو ظاہر سے گزر کر حقیقت تک پہنچ جائے، اور اسماء وتعبیرات کے اختلافات دور کر کے مقاصد و معانی کا اتحاد معلوم کر لے۔ بحدیکہ سارے نزاعات واختلافات دور ہو جائیں، اور سخت سے سخت منازع ومتضاد راہوں پر چلنے والے بھی دیکھ لیں کہ اصل مطلوب دونوں کا ایک ہی ہے۔

اس اصل کو پیش نظر رکھ کر اگر غور کرو گے تو واضح ہو جائے گا کہ جماعت، تعلیم، اطاعت، ہجرت اور جہاد دنیا کی وہ عالمگیر صداقتیں ہیں، جن کی حقیقت سے کسی فرد بشر کو انکار نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی کوئی صالح جماعت ایسی نہیں ہے جس نے ان سے الگ رہ کر کامیابی حاصل کی ہو۔ ہر عقل نے ان کا اقرار کیا ہے۔ ہر دل میں ان کا اعتقاد موجود ہے، اور ہر عامل جماعت شب و روز ان پر عمل کر رہی ہے۔ البتہ ناموں کے اختلاف نے ساری الجھن ڈال دی ہے۔ اسلام نے جن ناموں سے ان کو تعبیر کیا ہے ان سے دنیا کو اختلاف ہے لیکن اسلام جن حقیقتوں کو پیش کرتا ہے ان سے دنیا اختلاف نہیں کر سکتی۔ اگر کرے تو زندگی اور مراد سے محروم ہو جائے۔

اس نظام میں پہلی چیز ''جماعت'' ہے جس کی تشریح مختصر اوپر گزر چکی ہے۔ غور کرو، دنیا کا کون سا کام ایسا ہے جس کو بلا اجتماع و جماعت کے انجام دیا جا سکتا ہے۔ جماعت کی زیادہ دقیق اور فلسفیانہ تعریف چھوڑو۔ صاف اور سیدھے سادے معنی جو ہو سکتے ہیں، صرف انہیں پر غور کرو۔

---

[1] تفہیمات میں لکھتے ہیں ''لما تمت بی رودۃ الحکمۃ، البسنی اللہ خلعت الجددیۃ، فعلت علم الجمع بین المختلفات۔

Marfat.com

سوسائٹی، پارٹی، کمیٹی، کلب، انجمن، کانفرنس، پارلیمنٹ، بلکہ قوم، ملک، فوج ان سب سے مقصود کیا ہے؟ یہی کہ ''جماعت'' اور ''التزام جماعت'' وحشی قوموں تک کو دیکھتے ہو کہ جنگل کے درختوں کے نیچے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور مل جل کر اپنے معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں۔ پھر جماعت بے سود ہے اگر اس کا نظام نہ ہو اور کوئی سردار و رہنما نہ ہو۔ تم پانچ آدمیوں کی بھی کوئی مجلس منعقد کرتے ہو، تو سب سے پہلے ایک پریسیڈنٹ کا انتخاب کرتے ہو اور کہتے ہو کہ جب تک کسی کو صدر مجلس نہ مان لیں گے، یہ پانچ آدمیوں کی مجلس بھی باقاعدہ کام نہ کر سکے گی۔ فوج ترتیب دیتے ہو تو دس آدمیوں کو بھی بغیر ایک افسر کے نہیں چھوڑتے، اس کی اطاعت ماتحتوں کے لئے فرض سمجھتے ہو اور یقین کرتے ہو کہ بغیر اس کے فوج کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ پانچ دس آدمی بھی اگر بغیر امیر کے کام نہیں کر سکتے تو قومیں کیونکر اپنے فرائض بلا امیر کے انجام دے سکتی ہیں؟ اس سے بھی سادہ تر مثال یہ ہے کہ اپنے اپنے گھروں اور خاندانوں کو دیکھو، خود تمہارا گھر بھی تو ایک چھوٹی سی آبادی ہے؟ اگر بیوی تمہارا حکم نہ مانے تو تم کیوں بگڑتے ہو؟ اگر گھر کے لوگ تمہارے کہنے پر نہ چلیں، تو تم کیوں لڑتے ہو؟ تم کہتے ہو کہ فلاں گھر میں امن و انتظام نہیں، روز خانہ جنگی ہوتی ہے۔ یہ سب کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ ''الجماعت والسمع والطاعتہ'' کوئی جماعت امن و نظم نہیں پا سکتی جب تک اس کا کوئی امیر نہ ہو، اور جب تک امیر کی اطاعت نہ کی جائے کوئی بات نہیں بن سکتی۔ گھر اور خاندان بھی ایک چھوٹی سی جماعت ہے۔ تم گھر کے بڑے ہو، یعنی امیر ہو، پس گھر کی عافیت و کامیابی اس پر موقوف ہے کہ سب تمہاری سنیں اور تمہارے کہے پر چلیں۔

''ہجرت'' کا لفظ کس قدر تمہارے لئے ناآشنا اور نامانوس ہے؟ تم سمجھتے ہو کہ یہ دنیا کے اس عہد جہل و وحشت کی یادگار ہے جب مذہبی جذبات کی برانگیختی نے تمدنی احساسات کو مغلوب کر دیا تھا، اور انسان دین پرستی کے جنون میں اپنی عقلی و تمدنی زندگی

Marfat.com

تک کو قربان کر دیتا تھا۔ لیکن بتلاؤ، اب دنیا کی اعلیٰ علمی و تمدنی ترقیاں بھی تم کو جس راہ کی طرف بلا رہی ہیں، وہ ''ہجرت'' کی حقیقت سے کب خالی ہیں اور خود علم و تمدن کا تمام ذخیرہ عروج بھی کس عمل حقیقت کا نتیجہ ہے؟ ''ہجرت'' سے مقصود یہ ہے کہ **اعلیٰ مقاصد کی راہ میں کمتر فوائد کو قربان کر دینا اور حصول مقاصد کی راہ میں جو چیزیں حائل ہوں ان سب کو ترک کر دینا** خواہ آرام و راحت ہو، مال و دولت ہو، نفسیاتی خواہشیں ہوں۔ حتیٰ کہ قوم ہو، ملک ہو، وطن ہو، اہل و عیال ہوں سب کو چھوڑ دینا۔ پھر بتلاؤ علم و عمل کا کون سا گوشہ ہے جس میں کامیابی بغیر اس جذبہ کے مل سکتی ہے؟ انسان کی مطلوبات میں سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ایسی بتلا سکتے ہو جو بلا ہجرت کے مقام سے گزرے اس نے پالی ہو؟ یہ دنیا کی عملی و تمدنی ترقیاں، حیرت انگیز اکتشافات، انقلاب انگیز ایجادات، دولت کی فراوانی، تجارت کی عالمگیری، نئی نئی آبادیوں کا قیام، طرح طرح کے وسائل معیشت و فلاح کا ظہور، پھر ملکوں کا عروج قوموں کی بالادستی، تمدن کی وسعت فی الحقیقت انسان کے کس عمل حق کے نتائج و ثمرات ہیں؟ اگر کج نظری چھوڑ دو، تو معلوم کر لو گے کہ صرف عمل ہجرت کے۔ اگر انسان اور انسانوں کی جماعتوں نے طلب مقاصد و عزائم میں ہزاروں قربانیاں نہ کی ہوتیں، ہر طرح کے آرام و راحت سے مفارقت نہ کر جاتے، اپنی ساری خواہشوں اور ولولوں کو ترک نہ کر دیتے، گھر کے عیش اہل و عیال کی محبت، خویش و بیگانہ کی الفت اور ملک و وطن کی دامن گیریوں سے بالکل آزاد ہو کر راہ ہجرت میں قدم نہ اٹھاتے، تو آج دنیا میں علم کی جگہ جہل ہوتا۔ تمدن کی جگہ وحشت ہوتی، آبادیوں کی جگہ جنگل ہوتے اور ان تمام ترقیوں میں سے ایک ترقی بھی کرہ ارضی کی پشت پر نظر نہ آتی۔ دنیا میں جس قدر علوم و فنون موجود ہیں، ان سب کی تکمیل کیونکر ہوتی۔ اگر ولولہ ہجرت سے انسان کا قلب خالی ہوتا؟ کتنے ہی انسانوں نے اپنے گھروں اور وطنوں سے ہجرتیں کی ہیں، دنیا کے ایک ایک گوشہ، ایک ایک چپہ کو چھان مارا ہے جب کہیں جا کر فن طب کی

Marfat.com

تکمیل ہوئی ہے اورادویہ واشیاء کے خواص کا علم ہوا ہے۔ اگر مہاجرین علم کے قافلے اپنے اپنے گوشوں سے نہ نکلتے۔ اور گھر کے آرام وراحت کی جگہ سفر و غربت کی صوبتیں گوارا نہ کر لیتے تو اشیاء کی تخلیق کیونکر ہوتی، پیداوار کی معلومات کیونکر تکمیل پاتیں؟ جغرافیہ کیونکر وجود میں آتا؟ علم الحیات کے تجارب کی جزئیات کیونکر جمع ہو سکتیں؟ نئی نئی ایجادات اور اکتشافات کی کس طرح راہ کھلتی؟ کولمبس اگر ہجرت نہ کرتا، تو آج دنیا کا نصف تمدن ناپید تھا۔ یورپ اگر ہجرت نہ کرتا تو آج نیو یارک اور واشنگٹن کی سر بفلک عمارتوں کا وجود نہ ہوتا۔ اگر یورپ کی قومیں اپنے ملکوں سے مہاجرت نہ کرتیں، تو آج تمام دنیا کی دولت ان کے گھروں میں کھینچ کر نہ جاتی۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اگر صرف قطب شمالی کی تحقیق کیلئے مہاجرین کشف کے ڈیڑھ سو قافلے یکے بعد دیگرے نکلیں، اور یکسر قربان و ہلاک ہو جائیں تو تم کہو کہ یہ تحقیق علم کا کمال اور جذبہ نوع پرستی کی انتہا ہے، لیکن اگر اسی چیز کو اللہ کی شریعت ایک جامع تر لفظ ''ہجرت'' سے تعبیر کرے، تو تم اس کا انکار کر دو۔ تمہارے نزدیک یہ تو تمدن ہے کہ دریائے نیل کا مخرج دریافت کرنے کے لئے سینکڑوں انسان اپنا گھر بار چھوڑ دیں اور ہلاک ہو جائیں، لیکن یہ وحشت ہے کہ قیام حق اور اشاعت صداقت کی راہ میں اللہ کے بندے ترک وطن کریں؟ اگر نیوٹن اپنی راتوں کی نیند اور بستر کی راحت چھوڑ دے تا کہ کشش ثقل کا قانون دریافت کرلے تو تم اس کی پرستش کرو اور کہو کہ یہ علم پرستی ہے۔ لیکن اگر تم عزم وطلب کے ایسے ہی پرستار نہ ہو تو اس عازم صادق کیلئے کیا کہتے ہو جو قانون کشش ثقل کیلئے نہیں بلکہ قانون نجات عالم کیلئے اپنا گھر بار چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ حق پرستی ہے؟

آج تمام یورپ قومی ترقی اور ملکی استحکام کی سب سے بڑی بنیاد ''کالونیل سسٹم'' کو یقین کرتا ہے یعنی نو آبادیوں کے اصول کو اور اس کا اس درجہ پرستار ہے کہ صرف اسی کی خاطر پانچ سال تک دنیا کو عالمگیر جنگ وقتال میں مبتلا رکھتا ہے۔ لیکن نو

Marfat.com

آبادیوں کے اصول کے کیا معنی ہیں؟ یہی کہ ترک وطن کر کے اپنی نئی نئی آبادیاں قائم کرنا، اور قومی دولت وطاقت کو بڑھانے کے لئے دنیا میں دور دور تک پھیل جانا۔ اب غور کرو کہ یہ وہی ''ہجرت'' اور ترک وطن کی بات ہوئی یا نہیں؟ اور الجماعة، والسمع، والطاعة، والمهجرة پر دنیا عمل کر رہی ہے یا نہیں؟ نام مختلف ہیں مگر حقیقت ایک ہی ہے۔

''جہاد'' کے معنی یہ ہیں کہ دفع اعداء میں اپنی جان و مال سے کمال درجہ سعی ومحنت کرنا۔ کیا دنیا میں کوئی قوم، کوئی ملک، کوئی جماعت، کوئی قبیلہ، کوئی خاندان، کوئی گھر، کوئی انسان بلکہ کوئی وجود اور زندگی بغیر جہاد کے زندہ و قائم رہ سکتی ہے؟ کون ہے جو زندہ رہنا چاہتا ہے اور جہاد نہیں کرتا؟ جس چیز کو تم ہزاروں ناموں اور لفظوں میں بولتے ہو اور کارزار ہستی میں بقاء و قیام کی اصلی بنیاد سمجھتے ہو، اسی کو اسلام نے ایک جامع لفظ جہاد سے تعبیر کیا ہے۔ اگر تم سے ڈارون اور رسل ویلیس تنازع للبقاء (Struggle For Existence) اور انتخاب طبیعی (Natural Selection) اور بقاء اصلح (Survival of the Fittest) کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کارزار حیات میں بقاء صرف اصلح و امثل کے لئے ہے، تو تم پوری طرح کان دھرتے ہو، اور فطرت کے قتل و غارت کا افسانہ خونیں تم کو پریشان خاطر نہیں کرتا۔ لیکن اسی حقیقت کو قرآن و اسلام زیادہ اکمل شکل میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو قانون الٰہی زمین کے کیڑوں مکوڑوں تک نافذ ہے۔ اس سے جمعیت بشری کیونکر بری ہو سکتی ہے، پس دنیا میں اسی قوم کو باقی رہنا چاہئے جو حق و ہدایت کے اعتبار سے اصلح ہو۔ غیر اصلح عقائد و اعمال کو مٹ جانا چاہیے اور قانون الٰہی کا ہاتھ بن کر مٹا دینا چاہیے۔ ہدایت یافتہ اقوام کا یہ حق ہے کہ غیر ہدایت یافتہ قوموں پر غالب آئیں۔ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ پھر اس بات پر تم کیوں مضطرب ہوتے ہو؟ کیوں اس قدرتی قانون ہستی کے ذکر میں تم کو قتل و غارت گری کی دہشت ناکی نظر

Marfat.com

آتی ہے؟ یورپ کی قومیں تمام دنیا کو اپنی نو آبادیوں سے بھر دیں، اور کہیں کہ افریقہ کے وحشیوں کی جگہ ہم متمدن اقوام زیادہ اللہ کی زمین کی حقدار ہیں۔ اس کو تو تم گوارا کرلو، لیکن اگر اسلام کہے کہ "اِنَّ الْاَرْضَ اِلٰہَ وَلِرُسُوْلِہٖ" خدا کی زمین حق پرستوں کیلئے ہے۔ کفر وضلالت کے پرستاروں کیلئے نہیں تو تم اس کو وحشت اور خوفناک کہو؟

۸۔ تعیین خطاب:۔

تعیین خطاب نظم کلام کے فہم کی کلید ہے۔ اس سے بے خبری غلطیوں کا باعث بن جاتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہئیے کہ قرآن کا اسلوب بیان تحریری نہیں بلکہ تقریری ہے۔ رسول کریم ﷺ پر بھی تقریر نازل ہوتی تھی۔ تقریر اور تحریر کی زبان میں بہت فرق ہے۔ تقریر میں متکلم اور مخاطب بار بار بدلتے ہیں۔ مقرر کبھی اپنے لئے غائب کا صیغہ استعمال کرتا ہے اور کبھی خود متکلم ہوتا ہے۔ مخاطب کے لئے کبھی حاضر کا صیغہ استعمال کرتا ہے اور کبھی غائب کا، کبھی واحد کا صیغہ بولتا ہے کبھی جمع کا، کبھی کسی بالائی طاقت کی نمائندگی کرنے لگتا ہے اور کبھی بالائی طاقت خود اس کی زبان سے بولنے لگتی ہے۔ بعض مرتبہ ایک کلام کو بلا واسطہ براہ راست (Direct) حیثیت سے پیش کرتا ہے اور بعض مرتبہ بالواسطہ (Indirect) طریق[1] سے تقریر میں یہ چیز حسن پیدا کرتی ہے مگر تحریر میں یہ بڑا نقص ہوتا ہے۔ قرآن کے علاوہ دوسری الہامی کتابوں میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ زبور میں ہے "لشکروں کا خداوند تمہارے ساتھ

---

[1] براہ راست کلام (Direct Speech) اور بالواسطہ کلام (Indirect Speech) کا فرق وامتیاز پیش نظر نہ رکھنے سے عارف رومی جیسی شخصیت سے بھی ایک لغزش ایسی ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ ان کی لغزش کو معاف فرمائے۔ قل یا عبادی الذین اسرفوا میں خطاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی طرف ہے۔ یعنی یہ براہ راست کلام (Direct Speech) میں ہے کہ اے نبی میرے بندوں کو کہدے کہ اے میرے وہ بندو جنہوں نے اوپر زیادتی کی ہے۔ اس میں پیغمبر کو خطاب ہے کہ آپ یہ پیغام حرف بحرف بندوں کو پہنچادیں۔ یعنی عارف رومی کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ آنحضرت ﷺ کو حکم دیا ہے کہ آپ لوگوں کو یا عبادی الذین اسرفوا کے الفاظ سے خطاب کریں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو نبی کا بندہ بنادیا۔

Marfat.com

ہے......... خاموش ہو اور جان لو کہ میں خدا ہوں............ لشکروں کا خداوند میرے ساتھ ہے۔" (پ ۶۴ آیات ۷۔۱۱) بعض مرتبہ مخاطب نبی کو کیا جاتا ہے۔ تورات میں بھی اس کی مثالیں کثرت سے ہیں۔ مخاطب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صیغہ واحد میں کیا لیکن مراد امت ہے۔ نظم و سیاق اس قسم کے موقع کی رہنمائی کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں سورۃ توبہ کی ایک آیت ہے:۔

اِنْ تُصِبْکَ حَسَنَۃٌ تَسُؤْھُمْ وَاِنْ تُصِبْکَ مُصِیْبَۃٌ یَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَا اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ.

ترجمہ: "اگر تم کو بھلائی پہنچتی ہے تو ان کو تکلیف ہوتی ہے اور اگر مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں خوب ہوا ہم نے اپنا بچاؤ پہلے ہی کر لیا۔"

یہاں خطاب "واحد" کا ہے لیکن مراد "عام مومنین" ہیں۔ چنانچہ اس کے جواب میں وضاحت ہوتی ہے۔

قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَا اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا ھُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ.

ترجمہ: "کہہ دو تم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچے گی مگر جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے، وہ ہمارا مولا ہے اور چاہیئے کہ اہل ایمان اللہ پر بھروسہ کریں۔"

اسلئے جب ہم قرآن حکیم میں غور وفکر کریں تو اس کے تقریری اسلوب میں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اس اسلوب بیان سے تقریر اپنے ماحول اور پس منظر کے ساتھ خود بخود جڑ جاتی ہے۔ اسے ماحول و پس منظر سے جوڑنے کیلئے الفاظ سے کام نہیں لینا پڑتا۔ صرف اس کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوتا ہے۔ لیکن تحریر کو ماحول و پس منظر سے جوڑنے کیلئے الفاظ سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ تقریر کی زبان کو تحریر کی زبان میں اس طرح منتقل کیا جائے کہ تقریر کا ربط بلا تحریر کی زبان میں خاص طور پر نمایاں ہو۔

Marfat.com

۹۔عربیت کا صحیح ذوق:-

قرآن میں تدبیر و تفکر کرنے کیلیۓ صرف عربی دانی کافی نہیں۔ بلکہ عربیت کا ذوق صحیح درکار ہے۔ یہ ذوق محض مقامات حریری، دیوان متنبّی، دیوان حماسہ یا ایم۔اے عربی کورس پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتا۔اس کے لئے ایک مدت دراز درکار ہے۔امام شافعیؒ کے بقول جب تک کسی شخص میں عربی عبارت کو عربی ہی کے انداز فہم و تعبیر کے مطابق سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی وہ قرآن مجید کے بلیغ اسلوب بیان اور مخصوص انداز تعبیر سے واقف نہ ہو سکے گا اور اس بنا پر قرآنی مفہوم و مطلب کے بہت سے گوشے اور پہلو ایسے ہوں گے جو اس کے عقل و گرفت میں نہ آسکیں گے۔'' قرآن مجید کو زبان عربی اور اس کے اسالیب کی مشکلات کے حل کیلیۓ کتب لغت، کلام عرب، کتب نحو و بلاغت سے مدد مل سکتی ہے۔کتب لغت میں سے لسان العرب سب سے اچھی لغت ہے۔مفردات امام راغب سے مبتدیوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔اس سلسلے میں لغت سے زیادہ قابل اعتماد چیز کلام عرب ہے۔

اس کے علاوہ دوسرے علوم زبان پر مثلاً نحو، اصول بیان بلاغت وغیرہ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ اپنے فوائد کی کثرت کے باوجود فہم قرآن کے نقط نظر سے کوتاہ ہیں۔ان علوم زبان پر علامہ حمید الدین فراہی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''موجودہ فن نحویت اضافہ کا محتاج ہے۔یہ صرف متوسط درجہ کے کلام کے لئے اصول فراہم کرتا ہے۔اس وجہ سے مفسر کو نہیں چاہیئے کہ وہ کلام الٰہی کو موجودہ اصول نحو پر بہت زیادہ منطبق کرنے کی کوشش کرے۔اس طرح کی کوشش کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کو کلام الٰہی میں ایسی ترمیم و تاویل کرنی پڑے گی جس سے ایک دیکھنے والے کو گمان ہوگا کہ قرآن مجید کی عام شاہراہ سے بالکل ہٹا ہوا ہے بلکہ اس کو کلام عرب سے وہ شہادتیں فراہم کرنی چاہئیں جن سے یہ ثابت ہو کہ قرآن ہی کا اسلوب زبان کا اصلی اور اعلیٰ اسلوب ہے۔''

Marfat.com

علم البیان کا حال بالکل نحو سا ہے۔ جو کلام ایک زندہ قلب کے اندر سے ابلتا ہے یہ کلام اس کی خوبیوں کو بھی واضح کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو آسمان وحی سے برسنے والا کلام اس کی تنگ نائے میں کہاں سے سما سکے گا؟ صاحب وحی بلکہ ہر داعیٔ حق کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب حالات تقاضہ کرتے ہیں اس کے قلب سے ایک چشمہ ابلتا ہے۔ وہ کبھی مجاز کے رنگ میں گفتگو کرتا ہے، کبھی حقیقت کے بھیس میں، لیکن ہر صورت میں وہ اپنی مخاطب جماعت کی فہم اور اپنی زبان کے طریقوں کی رعایت کرتا ہے۔ وہ باپ اور بیٹے کے الفاظ استعمال کرتا ہے، اپنے جسم کو مختلف جسموں میں بانٹتا ہے، اپنا گوشت وخون دوسروں کو کھلاتا ہے۔ ید، ساق، وجہ، عرش، کرسی وغیرہ کلمات اپنی گفتگو میں لاتا ہے سبط وقبض لف ونشر، حسرت، انتقام اور غضب ومحبت وغیرہ وغیرہ استعمال کرتا ہے اور اس کے مخاطب ان کو بے تکلف سمجھتے ہیں۔ البتہ جو شخص علم بیان کی زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑے گا، وہ چیونٹی کی طرح چلے گا اور اندھوں کی مانند ٹھوکریں کھائے گا۔ زبور اور صحف انبیا کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ آسمانی کلام میں مجاز کو کس قدر دخل ہوا کرتا ہے۔

فن بلاغت کو لوگوں نے صرف اشعارے سے مستنبط کیا ہے اور اشعار کا دائرہ معلوم ہے کہ وہ صرف دربست کی خوبیوں، الفاظ کی نزاکتوں اور بدیع کی صنعت کاریوں تک محدود ہے۔ باقی رہے حسن استدلال کے گوناگوں پہلو، ربط معانی کے مختلف انداز، ضرب المثال کے مختلف طریقے، قصص سے عبرت پذیری کے مختلف ڈھنگ، کلام کا بڑھ کر اپنے مرکز کی طرف لوٹنا، زجر اور عتاب، متکلم کی شدت، یقین کا اظہار، مترفعانہ اعراض، ناصحانہ اظہار حسرت وغیرہ جن کی مثالیں صرف خطباء کے کلام اور انبیاء علیہم السلام کی وحی میں مل سکتی ہیں، ہمارے فن بلاغت نے ان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔ یہ خطبائے عرب کا کلام ان لوگوں کو زیادہ ملا نہیں اور خطبائے عجم کے کلام پر انہوں نے غور نہیں کیا۔ چنانچہ باقلانیؒ نے باوجودیکہ بلاغت قرآن کو بے

Marfat.com

نقاب کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کرڈالا ہے لیکن استناد کے لئے تمام تر صرف اشعار پر اعتماد کیا۔ خطبات کے صرف تھوڑے سے نمونے دے دیئے ہیں تا کہ مقابلہ کر کے تم خود کچھ فرق معلوم کرلو۔

پھر موجودہ علم بلاغت اسالیب کلام کی معرفت کیلئے کوئی قیمتی رہنمائی اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اس فن کے مصنفین عموماً عجمی ہیں اور اہل عجم کیلئے عرب کے انداز و اسالیب پر غور کرنا اور ان کو سمجھنا نہایت مشکل ہے۔ پس بجائے اس کے کہ ان کی کوتاہیوں اور نارسائیوں کی شکایت کی جائے جو تھوڑی بہت خدمت انہوں نے اس فن کی سرانجام دی ہے اس پر ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ یہ کیا کم ہے کہ بعض جگہ ان کا تیر نشانہ پر لگا ہے اور بعض جگہ اگر نشانہ پر نہیں لگا تو اس کے قریب پہنچا ہے۔[1]

۱۰۔ علامات وقف :-

ہر زبان کا طالب علم جانتا ہے کہ زبان میں علامات وقف (Punctuation) کی کیا اہمیت ہے؟ علامات وقف کی معمولی سے تبدیلی کے ساتھ فقرے کا مطلب و مفہوم بالکل الٹ جاتا ہے۔ ''روکومت، جانے دو اور روکو، مت'' پیش کی جانے والی مثال عام ہے۔ قرآن حکیم کی آیات میں علامت وقف کی معمولی سی تبدیلی مفہوم کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہے۔ سورۃ یوسف میں ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ. (یوسف ۱۲ : ۲۸)

ترجمہ: ''عزیز کی بیوی نے ارادۂ بد کر لیا تھا اور یوسف بھی ارادہ کر لیتے اگر وہ اپنے رب کی بُرہان کو نہ دیکھ لیتے۔''

آپ کو بہت سے قرآن مجید ایسے ملیں گے جہاں علامات وقف هَمَّتْ بِهٖ کے بعد نہیں بلکہ هَمَّ بِهَا کے بعد لگائی گئی ہے اور عبارت اس طرح ہو گئی ہے۔

---

[1] مقدمہ نظام القرآن

Marfat.com

هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا. ط

آپ کچھ سمجھے؟ وَهَمَّ بِهَا کے بعد علامت وقف لگانے سے آیت کے معنی کیا ہو گئے ہیں؟ اب اس آیت کے معنی یہ ہیں۔

''عزیز کی بیوی نے بھی ارادہ کر لیا تھا اور یوسفؑ نے بھی ارادہ بد کر لیا تھا۔''

اور اس کے بعد لَوْ لَا اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ کے یہ معنی کرتے ہیں کہ ''یوسفؑ اگر اپنے رب کی دلیل کو نہ دیکھ لیتے تو اپنے ارادہ بد کو عملی جامہ پہنا دیتے۔''

پہلے اعتبار سے مفہوم تو یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ارادہ کیا ہی نہیں تھا۔

دوسرے اعتبار سے مفہوم یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ارادۂ بد تو کر لیا تھا لیکن اسے عملی جامہ نہ پہنایا۔

علامت وقف کی جگہ بدل دینے سے نبی کے دامن عصمت و تقویٰ کو ہوا و ہوس سے آلودہ کر دیا اور پھر کوفہ و بصرہ کے نحوی، ایک پیغمبر کی پاکیزگی و قلب و نگاہ کا خیال رکھتے ہوئے اس بات پر مصر ہیں کہ دوسرا مفہوم صحیح ہے کیونکہ لولا کی جزا مقدم نہیں آ سکتی، اس لئے محذوف ہے حالانکہ قرآن میں بیسیوں مقامات ایسے جہاں کہ لولا کی جزا پہلے لائی گئی ہے۔ مثال کے طور پر میں ایک مقام پیش کرتا ہوں۔ سورۃ اعراف میں ہے۔

وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَا اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ. (اعراف ۷ : ۴۳)

ترجمہ: ''ہم کبھی اس کی راہ نہ پاتے اگر وہ ہماری رہنمائی نہ کرتا۔''

ان نحویوں کو یہاں بھی چاہیئے تھا کہ نَهْتَدِيَ کے بعد علامت وقف لگا کر لَوْ لَا اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ کی جزا کو محذوف مانتے۔ پس ثابت ہوا کہ لَوْ لَا کی جزا مقدم آتی ہے اور جہاں اس کی جزا مقدم ہو وہاں مفہوم میں حصر پیدا ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

۱۱۔قرآن حکیم اور دیگر کتب سماویہ:۔

قرآن حکیم اور دیگر کتب سماویہ کی اصل ایک ہے۔ یہ سب وحی کے پاک سرچشمہ سے نکلی ہیں۔ان میں گہری مماثلت اور مشابہت ہے اور ایک دوسرے کے معانی کی طرف رہبری کرتی ہیں۔ قرآن حکیم پچھلی کتابوں کا مصدق ہے لہٰذا ان کی باہمی موافقت، ایمان کی پختگی اور زیادتی کا باعث بنتی ہے۔قرآن اختلاف کو ختم کرنے والی کتاب بھی ہے۔ پرانے صحیفے چونکہ متروک ومحرف ہو چکے ہیں۔ان کی زبان بھی مٹ چکی ہے اس لئے انہیں لغت قرآن کی رہنمائی میں سمجھنا چاہیے۔ نیز ان کتب سماویہ میں کوئی ایسی بات ہے جو قرآن کے معانی یا اسلوب سے ملتی جلتی ہو یا اس کے ساتھ واضح تعلق رکھتی نظر آئے تو پورے غور و تدبر سے سمجھنا چاہیئے۔ یہ چیز قرآن اور کتب مقدسہ دونوں کی صداقت کی دلیل بنے گی۔اس میں کچھ شک نہیں کہ ان کتب مقدسہ میں اسرائیلیات کا جز بھی شامل ہو گیا ہے۔انبیائے کرام کی زندگی کے حالات اور واقعات بھی مسخ کر ڈالے گئے ہیں۔لیکن پھر بھی ان کتابوں میں اخلاقی تعلیمات اور دیگر امور واحکام کا بیشتر حصہ ایسا ہے جو کہ ان تراجم کے بعد بھی اصل حالت میں موجود ہے۔لیکن مسلمان ان تعلیمات کو ناقابل عمل سمجھتے ہوئے ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔اگر ہم ان میں غور و فکر سے کام لیں تو حکم و بصائر کا ایک خزانہ ہمیں مل سکتا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت کو جس طرح پیش کیا گیا، فی الحقیقت نوع انسانی کا ایک بڑا ظلم ہے جو تاریخ انسانیت کے اس عظیم الشان رہنما کے ساتھ جائز رکھا گیا ہے اور اس ظلم میں بے درد نکتہ چین اور نادان معتقد برابر کے شریک ہیں۔

ہم بحیثیت مسلمان ان کی تعلیم کو اگر فطرت انسانی کے خلاف سمجھیں یا یہ تصور کریں کہ محض ایک اخلاقی واعظ یا مصلح تھے تو ایسا خیال قرآن کی دعوت کی اصل بنیاد کو متزلزل کر دے گا۔ہم تفریق مِنَ الرُّسُلُ کے مرتکب ہوں گے اور اَلْكٰفِرُوْنَ حَقًّا (النساء:۱۵) کے زمرے میں شمار۔

Marfat.com

ابناء الوقف انسانوں کے ایک طبقہ نے حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کی مقدس شخصیتوں کو غلط رنگ میں پیش کر کے انبیائے کرام کے کردار و سیرت کا نقشہ یوں بھی کھینچا ہے کہ انبیا نے نظام کفر کے اندر نہ صرف مذہبی اور اخلاقی اصلاح پر اکتفا کیا ہے بلکہ اس کے مطیع وفادار بن کر رہے اور اگر موقع ہاتھ آیا تو اس نظام کفر کو چلانے اور فروغ دینے کے لئے اپنی خدمات بھی پیش کیں۔ اس نظریہ کی گمراہی کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ دین کو ایک معقول، مرتب، مربوط اور متناسب نظام فکر کی حیثیت سے نہیں رکھتے بلکہ قرآن کی ایسی تاویلیں و تفسیریں کرتے ہیں جس سے ایک جز دوسرے جز سے، ایک پہلو دوسرے پہلو سے متصادم ہو۔ نبی اخلاقی واعظ یا مصلح نہیں ہوتا۔ ہر نبی بلا استثنائے احدے اپنے وقت کے کافرانہ نظام تمدن وسیاست کو مٹانے اور اس کی جگہ دین حق [1] کو قائم کرنیکیلئے آیا۔ نبی آتے ہی ایک ایسا نظام قائم کرنے کے لئے سعی و جہد کرتا ہے جس میں حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کیلئے ہوتا ہے۔

زندگی کا پورا نظام اطاعت اپنے تمام اجزا سمیت اللہ کی اطاعت کے تابع کرتا ہے جس کو منضبط کرنے والا اللہ کا قانون ہوتا ہے۔ اس لئے نبی کے اعلان نبوت کے روز اول ہی سے نبی کا حملہ اس نظام فاسد پر ہوتا ہے۔ اس کا نصب العین بھی روز اول سے یہی ہوتا ہے۔ نبی اپنی دعوت کے کسی مرحلے پر بھی فاسقانہ نظام اور اس کے سربراہوں کی قصیدہ خوانی نہیں کرتا اور کبھی یہ نہیں کہتا کہ یہ قصیدہ خوانی ''جہاد بالقلم'' ہے۔ یا ''یہ مکی زندگی'' کا دور پھر شروع ہوگا۔ اپنی طاغوت پرستی پر پردہ ڈالنے کیلئے یہ وہ عظیم ذہنی مغالطہ ہے جس میں سادہ لوح اور علم بصیرت سے محروم مسلمان کو مبتلا کیا

---

[1] دین کا لفظ قریب وہی معنی رکھتا ہے جو زمانہ حال (State) کے معنی ہیں۔ لوگوں کا کسی بالاتر اقتدار کو تسلیم کر کے اس کی اطاعت کرنا، یہ سٹیٹ (State) ہے یہی دین کا مفہوم ہے اور ''دین حق'' یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کی، خود اپنے نفس کی اور تمام مخلوقات کی غلامی واطاعت چھوڑ کر اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے۔

Marfat.com

جاتا ہے۔ ''جہاد بالقلم'' کو کوئی کافرانہ نظام برداشت کرہی نہیں سکتا، جہاد بالقلم پر پابندیاں ہوتی ہیں، جہاد بالقلم پر آرڈی نینس ہوتے ہیں۔ مجاہد کافرانہ نظام کی قصیدہ خوانی کی بجائے اس پر پوری شدت سے تنقید کرتا ہے، اس کی ایک ایک جز کو ہدف بنا کراس کی برائیاں الم نشرح کرتا ہے اور اللہ کی حاکمیت کو قائم کرنے کی دعوت عام دیتا ہے۔ حقیقت یوں ہے کہ داعی حق کے نصب العین اور اس کی دعوت میں کسی مرحلے پر کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، داعی حق کا شروع کا زمانہ اپنے نصب العین کی طرف دعوت اور اس کے حصول کی تیاری کا زمانہ ہوتا ہے اور اس کے بعد اس تیار شدہ مواد کو استعمال میں لاکر نصب العین کو عملی طور پر قائم کرنے کا م۔ یہ نہیں ہوتا کہ تیاری کے زمانہ میں کچھ اور اصول و نصب العین ہو اور بعد کے زمانہ میں کچھ اور۔ ''مکی دور'' ہو یا ''مدنی دور'' دونوں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں بلکہ ''مکی دور'' ''مدنی دور'' سے زیادہ اہم اور انقلاب در آغوش ہوتا ہے، ابن الوقتی، کافرانہ نظام کی قصیدہ خوانی، اس کے سربراہوں کی عاجزانہ خوشامد اور کاسہ لیسی کا دور نہیں ہوتا۔

سیدنا حضرت یوسفؑ علیہ السلام کے متعلق تو ہم اپنے موقع پر ثابت کریں گے کہ ان کی دعوت کا آغاز ہی ارباب متفرقون سے بغاوت اور اللہ واحد القہار کی غلامی واطاعت سے ہوا اور پھر یہی دعوت ''دین الملک'' کو مٹانے اور اس کی جگہ ''دین اللہ'' کو قائم کرنے پر منتج ہوئی۔ اس مقام پر یہ حقیقت واضح کرنی چاہتے ہیں کہ تمام انبیاء کی طرح سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام نے اہل فلسطین کو بھی حکومت الٰہیہ کے قیام کی دعوت دی تھی۔ وہ وقت کے نظام تمدن وسیاست کو مٹانے اور اس کی جگہ ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتے تھے جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر ہو۔ یہاں حضرت مسیح علیہ السلام کے اقوال انجیل سے ایک خاص ترتیب کے ساتھ نقل کیے جاتے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ ایک اخلاقی واعظ اور مصلح نہیں تھے بلکہ حکومت الٰہیہ کے داعی تھے۔ انجیل کی یہ عبارتیں ان لوگوں کیلئے بھی سرمہ بصیرت ثابت ہوں گی جو اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔

Marfat.com

"فقیہوں میں سے ایک نے ....اس سے پوچھا کہ سب حکموں میں اول کون سا ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ اول یہ ہے اے اسرائیل سن، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند[1] ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے، اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ!.......... فقیہہ نے اس سے کہا اے استاد! کیا خوب! تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں"۔ (مرقس ۱۲: ۲۸-۳۲)

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اس کی عبادت کر"۔ (لوقا ۴: ۸)

"پس تم اس طرح دعا مانگا کرو کہ اے ہمارے باپ! تو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے، تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔" (متی ۶: ۹-۱۰)

آخری آیت میں حضرت مسیح نے اپنے نصب العین کو واضح کر دیا ہے۔ یہ جو عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ خدا کی بادشاہت سے ان کی مراد محض روحانی بادشاہت تھی، یہ آیت اس کی تردید کرتی ہے۔ ان کا صاف مقصد یہ تھا کہ زمین پر خدا کا قانون اور اس کا حکم شرعی اسی طرح جاری ہو جس طرح تمام کائنات میں اس کا قانون طبیعی نافذ ہے۔ اسی انقلاب کیلئے وہ لوگوں کو تیار کر رہے تھے۔

"یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ میں اس لئے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔ اور جو کوئی اپنی صلیب[2] نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا۔" (متی ۱۰: ۳۴-۳۹)

---

[1] "خداوند" اور "اللہ" دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔

[2] اپنی صلیب آپ اٹھائے سے مراد سزائے موت کیلئے تیار رہنا ہے۔ جس طرح اردو میں محاورہ ہے سر ہتھیلی پر لئے کر رکھنا۔

Marfat.com

"ہر کوئی میرے پیچھے آنا چاہیے وہ اپنی خودی [1] سے انکار کرے اور اپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہولے"۔ (متی ۱۶:۲۴)

"بھائی کو بھائی قتل کیلئے حوالہ کرے گا اور بیٹے کو باپ، اور اپنے اپنے ماں باپ کے خلاف کھڑے ہو کر انہیں مروا ڈالیں گے اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے۔ مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا۔" (متی ۱۰:۲۱۔۲۲)

"دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑیوں کے بیچ میں............ آدمیوں سے خبر دار ہو۔ کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالے کر دیں گے اور اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے ماریں گے اور تم میرے سبب ملکوں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کیئے جاؤ گے"۔ (۱۰:۱۶۔۱۸)

"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے ماں باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے [2] تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ آئے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تم میں ایسا کون ہے کہ جب وہ ایک برج بنانا چاہے تو پہلے بیٹھ کر لاگت کا حساب نہ کر لے کہ آیا میرے پاس اس کے تیار کرنے کا سامان ہے یا نہیں ایسا نہ ہو کہ جب نیو ماڈل کو تیار نہ کر سکے تو سب دیکھنے والے یہ کہہ کر اس پر ہنسنا شروع کر دیں کہ اس شخص نے عمارت شروع تو کی مگر تیار نہ کر سکا۔ تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کر دے، وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا"۔ (لوقا ۱۴:۲۶۔۳۳)

یہ تمام آیات صاف دلالت کرتی ہیں کہ مسیح علیہ السلام محض ایک دھرم کا پرچار کرنے نہیں آئے تھے بلکہ پورے نظام تمدن و سیاست کو بدل دینا ان کے پیش نظر تھا جس میں رومی سلطنت، یہودی ریاست، فقیہوں اور فریسیوں کے اقتدار اور فی الجملہ تمام بندگان نفس ہوائے نفس سے جنگ کا خطرہ تھا۔ اسی لئے وہ لوگوں کو کھلے الفاظ میں بتا دیتے تھے کہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں وہ نہایت خطرناک ہے اور میرے ساتھ اسی کو آنا چاہیئے جو ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہو۔

---

[1] اس سے مراد خود پرستی اور اغراض ذاتی سے دست بردار ہو جانا۔

[2] دشمنی کرنے سے مراد ان کی محبت اور ان کے مفاد کو اسلامی تحریک پر قربان کر دینا ہے۔

Marfat.com

''شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیرے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھ کو ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔'' (متی ۱۵: ۲۹۔۴۱)

''جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور روح کو قتل نہیں کر سکتے ان سے نہ ڈرو بلکہ اس سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے۔'' (متی ۱۰: ۲۸)

''اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں، بلکہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو۔'' (متی ۶: ۱۹۔۲۰)

''کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا.......... تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے.............. اپنی جان کی فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے اور نہ بدن کی کہ کیا پہنیں گے.............. ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بولتے ہیں نہ کاٹتے ہیں نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لئے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاٹتے ہیں۔ پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ حضرت سلیمان بھی باوجود اپنی شان و شوکت کے ان میں سے کسی کے مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو! تم کو کیوں نہ پہنائے گا؟ .... تم پہلے اس کی بادشاہت اور اس کی راست بازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمہیں مل جائیں گی۔'' (متی ۶: ۲۴۔۳۳)

''مانگو تو تمہیں دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو تم پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔'' (متی ۷: ۷)

عام غلط فہمی ہے کہ سیدنا مسیح نے رہبانیت اور ترک و تجرید کی تعلیم دی تھی۔ حالانکہ اس انقلابی تحریک کے آغاز میں لوگوں کو صبر، تحمل شدائد اور توکل علی اللہ کی تعلیم و تربیت دیئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ جہاں ایک نظام تمدن و سیاست پوری طاقت کے

Marfat.com

ساتھ زمین پر چھایا ہوا ہو اور تمام وسائل ذرائع زندگی اس کے قبضہ واختیار میں ہوں، ایسی جگہ کوئی جماعت انقلاب کے لئے اٹھ نہیں سکتی جب تک کہ وہ جان ومال کی محبت دل سے نکال نہ دے، سختیاں اٹھانے کو تیار نہ ہو جائے۔ اپنے بہت سے فوائد کو قربان کرنے اور بہت سے نقصانات گوارا کرنے کیلئے آمادہ نہ ہو، حاضر الوقت نظام سے لڑنا دراصل تمام آفات ومصائب کو اپنے اوپر دعوت دینا ہے۔ یہ کام جنہیں کرنا ہو انہیں ایک تھپڑ کھا کر دوسرے تھپڑ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ کرتہ ہاتھ سے جاتا ہو تو چوغہ بھی چھوڑ دینے کیلئے آمادہ ہونا چاہیے اور روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد ہو جانا چاہیئے۔ خزائن رزق فی الوقت جن کے ہاتھ میں ہیں، ظاہر ہے کہ ان سے لڑ کر رزق پانے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ لہذا جو اسباب قطع نظر کر کے صرف خدا کے بھروسہ پر اس راہ میں چھلانگ لگا سکتا ہو، وہی ان سے لڑ سکتا ہے۔

"اے محنت اٹھانے والو! بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ، میں تمہیں آرام دوں گا۔ میرا جوا اپنے اوپر اٹھالو........ کیونکہ میرا جوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا۔" (متی ۱۱:۲۸۔۳۰)

شائد حکومت الہیہ کا مینی فسٹو اس سے زیادہ مختصر اور پُر اثر الفاظ میں مرتب نہیں کیا جاسکتا۔ انسان پر انسانی حکومت کا جوا بڑا ہی سخت اور بڑا ہی بوجھل ہے۔ اس بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کو الٰہی حکومت کا نقیب جو پیغام دے سکتا ہے وہ یہی ہے کہ جس حکومت کا جوا میں تمہارے اوپر رکھنا چاہتا ہوں وہ نرم بھی ہے اور خفیف بھی۔

"غیر قوموں کے بادشاہ ان پر حکومت چلاتے ہیں اور جو ان پر امتیار رکھتے ہیں، وہ خداوند نعمت کہلاتے ہیں۔ مگر تم ایسے نہ ہونا بلکہ جو تم میں بڑا ہے وہ چھوٹے کی مانند بنے اور جو سردار ہے وہ خدمت کرنے والے کے مانند بنے۔" (لوقا ۲۲:۲۵۔۲۶)

مسیح علیہ السلام یہ ہدایت اپنے حواریوں یعنی صحابیوں کو فرماتے تھے۔ اس مضمون کے متعدد اقوال انجیلوں میں موجود ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ کہیں فرعونوں اور نمرودوں کو ہٹا کر تم خود فرعون ونمرود نہ بن جانا۔

Marfat.com

''فقیہہ اور فریسی [1] موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ انہیں اپنی انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کے دکھانے کو کرتے ہیں۔ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے رَبّی کہلانا پسند کرتے ہیں۔''

''اے ریا کار فقیہو! اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو، نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔''

''اے ریا کار فقیہو! اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کیلئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دوگنا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو''۔

''اے اندھے راہ بتانے والو! تم مچھر کو تو چھانتے اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔''

''اے ریا کار فقیہو! اور فریسیو! تم پر افسوس ہے، تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کے مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیاں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریا کاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔'' (متی ۲۳:۲۔۲۸)

یہ اُس وقت کے حاملانِ شریعت کا حال تھا۔ وہ علم رکھنے کے باوجود محض بندگیٔ نفس کی وجہ سے آپ بھی گمراہ تھے اور عام لوگوں کو بھی گمراہ کر رہے تھے اور اس انقلاب کے راستہ میں رومی قیاصرہ [2] سے بڑھ کر وہی حائل تھے۔

اس وقت فریسیوں نے جا کر مشورہ کیا کہ اسے کیونکر باتوں میں پھنسائیں۔ پس انہوں نے اپنے شاگردوں کو ہیرودیوں [3] کے ساتھ اس کے پاس بھیجا اور انہوں نے (یعنی شاگردوں نے) کہا کہ اے استاد! ہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور سچائی سے خدا کی

---

[1] فریسی مراد حاملان شریعت ہے۔ [2] قیاصرہ قیصر کی جمع۔ [3] مسیح علیہ السلام کے زمانے میں فلسطین کے ایک حصہ میں ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی طرح ایک یہودی ریاست قائم تھی جو سلطنت روما کی تابع فرمان تھی۔ اس کے بانی ہیرود کے نام پر اس کو عموماً ہیرودنی ریاست کہتے تھے۔ ہیرودیوں سے مراد اس ریاست کی پولیس یا سی۔آئی۔ڈی کے آدمی ہیں۔

Marfat.com

راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پرواہ نہیں کرتا.......... ہمیں بتاؤ کہ تو کیا سمجھتا ہے؟ قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں؟ یسوع نے ان کی شرارت جان کر کہا، اے ریاکار! مجھے کیوں آزماتے ہو؟ جزیہ کا سکہ مجھے دکھاؤ۔ وہ دینار اس کے پاس لے آئے۔ اس نے ان سے کہا یہ صورت اور نام کس کا ہے؟ انہوں نے کہا قیصر کا۔ اس پر اس نے کہا جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو"۔ (متی ۲۲: ۱۵۔۲۱)

اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل ایک چال تھی۔ فریسی اس تحریک کو ختم کرنے کے لئے چاہتے تھے کہ حضرت مسیح کا قبل از وقت حکومت سے تصادم کرا دیا جائے اور تحریک کے جڑ پکڑنے سے پہلے حکومت کے زور سے اسے کچلوا ڈالا جائے۔ اسی لئے ہیرودی ریاست کی سی۔ آئی۔ ڈی کے سامنے یہ سوال اٹھایا گیا کہ قیصر کو ٹیکس دیا جائے یا نہیں۔ جواب میں حضرت مسیح نے جو بات کہی اس کو دو ہزار برس سے مسیحی اور غیر مسیحی سب اس معنی میں لے رہے ہیں کہ عبادت خدا کی کرو اور اطاعت ہر اس حکومت کی کرتے رہو جو تمہارے زمانہ میں موجود ہو لیکن دراصل مسیح علیہ السلام نے نہ تو یہ فرمایا کہ قیصر کو ٹیکس دینا روا ہے۔ کیونکہ ایسا کہنا ان کی دعوت کے خلاف تھا اور نہ یہ فرمایا کہ اسے ٹیکس نہ دیا جائے، کیونکہ اس وقت تک ان کی تحریک اس مرحلہ تک نہیں پہنچی تھی کہ ٹیکس روکنے کا حکم دیا جاتا، اس لئے انہوں نے یہ لطیف بات کہہ دی کہ قیصر کا نام اور اس کی صورت تو قیصر ہی کو واپس کرو، اور سونا جو اللہ نے پیدا کیا ہے وہ اللہ کی راہ میں صرف کرو۔

اس سازش میں ناکام ہونے کے بعد فریسیوں نے خود مسیحؑ کے حواریوں میں سے ایک کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ کسی ایسے موقع پر مسیحؑ کو گرفتار کرائے جبکہ عام بلوے کا خطرہ نہ ہو۔ چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور یہوداہ اسکریوتی نے مسیحؑ کو پکڑوا دیا۔

"پھر ان کی ساری جماعت اٹھ کر اسے پیلاطس (رومی حاکم) کے پاس لے گئی اور انہوں

Marfat.com

نے الزام لگانا شروع کیا کہ اسے ہم نے اپنی قوم کو بہکاتے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرنے اور اپنے آپ کو مسیح بادشاہ کہتے پایا......... پیلاطُس نے سردار کاہنوں اور عام لوگوں سے کہا کہ میں اس شخص میں کچھ قصور نہیں پاتا۔ مگر وہ اور بھی زور دے کر کہنے لگے کہ یہ تمام یہودیہ میں بلکہ گلیل سے لے کر یہاں تک لوگوں کو سکھا سکھا کر اُبھارتا ہے......... وہ چلّا چلّا کر سر ہوتے رہے کہ اسے صلیب دی جائے اور ان کا چلّانا کارگر ہوا۔" (لوقا ۲۳: ۱۔ ۲۳)

اِس طرح دنیا میں مسیح علیہ السلام کا مشن اُن لوگوں کی بدولت ختم ہوا جو اپنے آپ کو حضرت موسیٰ کا وارث کہتے تھے۔ تاریخی شواہد کی رُو سے حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت کا کل زمانہ ڈیڑھ سال اور تین سال کے درمیان رہا ہے۔ اس مختصر مدت میں انہوں نے اتنا ہی کام کیا جتنا حضرت محمد ﷺ نے اپنی مکی زندگی کے ابتدائی دو تین سال میں کیا تھا۔ اگر کوئی شخص اُنجیل کی مذکورہ بالا عبارات کا مقابلہ قرآنِ مجید کی مکی سُورتوں اور زمانۂ قیامِ مکہ کی احادیث سے کرے گا تو دونوں میں بڑی مماثلت پائے گا۔ [1]

[1] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم از سید ابوالاعلیٰ مودودی

Marfat.com

قرآن اور علمی نظریات

ہمارا زمانہ تصورات ونظریات (Ideologies) کا زمانہ ہے۔ ہر قوم زندگی اور کائنات کے متعلق ایک نظریہ رکھتی ہے جواس کے تمام اعمال وافعال اور سرگرمیوں پر حاکم ہوتا ہے۔ انہی تصورات سے قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ ان میں زندگی کو ایک خاص طرز پر ڈھالنے کی بے پناہ قوت ہوتی ہے۔ ایسی قوت جو کسی ہائیڈروجن بم یا ایٹم بم کو بھی خاطر میں نہیں لاتی۔ موجودہ زمانے میں جن نظریہ ہائے حیات وکائنات نے قوموں کے اندر ذہنی انقلاب برپا کیے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء۔

۲۔ میکڈوگل کا نظریۂ جبلّت۔

۳۔ فرائڈ کا نظریۂ تحلیل نفسی۔

۴۔ میکیاولی کا نظریۂ قومیت وسیاست۔

۵۔ ہیگل کا نظریۂ تاریخ اور کارل مارکس کا نظریۂ اشتراکیت۔

موجودہ زمانے میں ان نظریات کو بڑی کامیابی اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان نظریات کی مقبولیت اور کامیابی کی وجوہات کیا ہیں؟

حق وباطل:-

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خارجی کائنات ہو یا انسانی دنیا، کامیابی صرف حق کیلئے مختص ہے، باطل بحیثیت باطل یہاں نہیں پنپ سکتا۔ اگر نظریات خالص باطل ہیں تو پھر ان کی مقبولیت اور کامیابی کی کیا وجہ ہے؟ ابھی جو ہم نے یہ کہا ہے کہ کامیابی

Marfat.com

حق کیلئے ہے، باطل یہاں نہیں پنپ سکتا۔ یہ جملہ وضاحت طلب ہے۔ آپ کے سامنے ایک عیاں حقیقت ہے کہ جھوٹ کو دنیا کا کوئی فرد بھی اچھا نہیں کہتا اور سچ کو کوئی برا نہیں کہتا۔ اگر کوئی شخص جھوٹ بولے تو سمجھتا ہے کہ برا کام کر رہا ہوں اور اگر جھوٹ کو پیش بھی کرتا ہے تو سچ کے نام سے۔ جھوٹے کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو سچا ثابت کرے، اس کے برعکس کبھی سچے انسان نے یہ کوشش نہیں کی کہ اپنے آپ کو جھوٹا ثابت کرے۔ اس طرح یہ تو ہوتا ہے کہ شر کا داعی اپنے آپ کو خیر کا علمبردار ظاہر کرے۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ خیر کا داعی اپنے آپ کو شر کا علمبردار بنا کر پیش کرے۔ خادم باطل اپنے آپ کو خادم حق کے بھیس میں پیش کرتا ہے، لیکن کبھی آپ نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کہیں خادم حق نے اپنے آپ کو خادم باطل کی حیثیت سے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہو۔ پیتل اور تانبے پر تو سونے کا ملمع کیا جاتا ہے لیکن کبھی سونے پر پیتل کا یا تانبے کا ملمع ہوتے دیکھا ہے؟ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ دراصل کائنات کا مزاج ہی ایسا ہے جو صرف حق کیلئے سازگار ہے۔ باطل یہاں قائم ہی رہ نہیں سکتا۔

حق اور باطل کے مرکبات:۔

حق قائم بالذّات ہے باطل اس کا طفیلی ہے۔ آکاس بیل کی کوئی جڑ نہیں ہوتی جس سے وہ زمین سے براہ راست غذا حاصل کرتی ہو، ہمیشہ کسی دوسرے درخت یا جھاڑی کے طفیل پرورش پاتی ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ حق اور باطل جہاں بھی ہوتا ہے حق کے سہارے پایا جاتا ہے۔ خالص باطل دنیا میں کہیں وجود نہیں رکھ سکتا۔ آکاس بیل کی طرح اس کی کوئی جڑ بھی نہیں ہوتی۔ یہ حق کی حاصل کردہ غذا کے بل پر پھیلتا، پھولتا اور پروان چڑھتا ہے۔ دنیا میں ہر برائی نیکی کا سہارا لے کر جیتی ہے۔ یہی حال نظام ہائے باطل کا ہے۔ دُنیا کا کوئی نظام باطل ایسا نہیں جو خالص باطل اور خالص برائیوں پر مشتمل ہو، حق کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور اس کے اجزا میں شامل ہوتا ہے۔ تمام

Marfat.com

نظامہائے باطل خالص باطل ہونے کی بجائے حق اور باطل کے مرکبات ہوتے ہیں۔ان کی مقبولیت،ان کا قیام،ان کا استحکام،ان کا پھیلاؤ حق کی اس مقدار کے اوپر منحصر ہوتا ہے جو اس میں موجود ہوتی ہے۔نظام اشتراکی میں بھی باطل موجود ہے اور آج کل کے دین جمہوریت میں بھی باطل کا ایک بڑا اجزشامل ہے،لیکن حق کی ایک مقدار اس کے ساتھ بھی ہے اور اس کے ساتھ بھی جس کے سہارے دونوں باطل جی رہے ہیں۔اس کے پاس بھی بعض بھلائیاں ہیں جن میں انسانیت کے لئے اپیل موجود ہے اور اس کے پاس بھی کچھ خوبیاں موجود ہیں جن میں فطرت آدم کے لئے کچھ کشش ہے۔یہ دونوں جب بلاتے ہیں تو اپنے بھلائی کے پہلو سامنے لاکر بلاتے ہیں اور لوگ قبول کرتے ہیں تو ان کی ان بھلائیوں ہی کے لئے قبول کرتے ہیں۔ان کی برائیاں تو ان کی بھلائیوں کے اوپر آکاس بیل کی طرح لپٹی ہوئی ہیں کہ ان کو قبول کیجئے وہ از خود آجائیں گی۔

جب کوئی نظام باطل حق کی کم سے کم مطلوبہ مقدار کی بھی کھو بیٹھتا ہے تو پھر اس کا پنپنا محال ہو جاتا ہے اور خالص باطل کے لئے تو دنیا میں کوئی جگہ ہی نہیں۔

تاریخ کو اسی نقطہ نظر سے دیکھئے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کسی نظام باطل کے قیام وبقا کا انحصار بھی اس کے جزوحق پر ہوتا ہے اور اس وجہ سے اس کی کامیابی دراصل حق کی کامیابی ہی کا نتیجہ ہے۔ماضی ہو یا حال،ہر اصول اور فلسفہ اور نظام اپنے جزوحق کی وجہ سے مقبول اور قیام پذیر ہے۔

قانون تصادم:

تاریخ اصولوں،فلسفوں اور نظاموں کے تصادم کی جولانگاہ ہے۔اس تصادم میں کامیابی اور ناکامی جس اصول پر ہوتی ہے وہ خود گواہی دیتا ہے کہ کامیاب حق ہے اور باطل بہر حال ناکام ہے۔

Marfat.com

یہ تو واضح ہے کہ خالص باطل کیلئے دنیائے انسانیت میں کوئی جگہ نہیں۔ حق و باطل کے مرکبات پائے جاتے ہیں۔ ان مرکبات میں تصادم ہوتا ہے اور ہر تصادم میں بازی اس اصول، فلسفے اور نظام کے ہاتھ رہتی ہے جس میں باطل کا تناسب کم اور حق کا تناسب زیادہ ہو۔ پانچ فیصد حق اور دس فیصد حق رکھنے والے اصول و نظام کے درمیان اگر ٹکر ہو گی تو دس فیصد حق رکھنے والا نظام میدان مار لے گا۔ ساری توڑ پھوڑ جو ذیل کی آیت کی رو سے ہوتی ہے:

وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ. (البقرہ: ۲۵۱)

ترجمہ: ''اگر اللہ لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے ہٹاتا نہ رہتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔''

پھر قانون تصادم کے ماتحت قرآن کا فلسفہ یہ بتاتا ہے کہ مرکبات حق و باطل میں کوئی بھی جب خالص حق کے سامنے آتا ہے تو اس کیلئے آخر کار لازماً شکست مقدر ہوتی ہے۔

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا. (بنی اسرائیل: ۸۱)

ترجمہ: ''اور کہہ دو کہ لو حق آ پہنچا اور باطل میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ بلا شبہ باطل ہے ہی بھاگنے والا۔''

زیادہ تفصیل کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ. لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّا تَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ. بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ط وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ. (الانبیاء ۲۱: ۱۶-۱۸)

ترجمہ: ''اور ہم نے آسمان و زمین اور ان کے اندر جو کچھ ہے اسے کھیل تماشے کی حیثیت سے پیدا نہیں کیا، اگر ہم چاہتے کہ اسے سامان تفریح بنائیں تو یقیناً (بغیر کسی حکیمانہ نظر کے) اسے ایسے ہی بنا لیتے بشرطیکہ ہم ہی کرنے والے ہوتے! لیکن (ہم نے ایسا نہیں کیا) بلکہ کائنات کو بڑے محکم اصول اور حکمت کے ساتھ بنایا ہے جس کے مطابق ہم حق کو باطل کے ساتھ ٹکراتے ہیں تو وہ حق باطل کا سر کچل کر رکھ دیتا ہے اور باطل میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے۔''

ایک اور مقام پر مثالیں بیان کر کے فرمایا:

Marfat.com

اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِیَۃٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّیۡلُ زَبَدًا رَّابِیًا ؕ وَمِمَّا یُوۡقِدُوۡنَ عَلَیۡهِ فِی النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡیَۃٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ ؕ کَذٰلِکَ یَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡحَقَّ وَالۡبَاطِلَ ۬ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ؕ (الرعد ۱۳:۱۷)

ترجمہ: "اللہ نے بادل سے پانی برسایا تو ندی نالے اپنے اپنے مقدر بھر بہہ نکلے۔ پھر وہ سیل اپنے اوپر پھولا ہوا جھاگ اٹھالیتا ہے اور اسی طرح زیور اور سامان ضرورت بنانے کے لئے آگ میں دو دھات پگھلاتے ہیں۔ اس پر بھی جھاگ آجاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے تو پھر جہاں تک جھاگ کا تعلق ہے وہ رائیگاں جاتا ہے اور جو انسانیت کیلئے نفع دینے والی چیز ہے، وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔"

جن متذکرہ صدر نظریات کو ہم زیر بحث لا رہے ہیں وہ نہ خالص حق ہیں اور نہ خالص باطل بلکہ حق و باطل کے مرکبات ہیں۔ ان کیلئے جو چیز مقبولیت اور کامیابی کا باعث ہے وہ ان کے اندر حق کے اجزا کا ہونا ہے۔ اب ہم ان کا بالترتیب یکے بعد دیگرے تجزیہ کرتے ہیں، سب سے پہلے مسئلہ ارتقاء ہے۔

Marfat.com

مسئلہ ارتقاء

مسئلہ ارتقاء کا تاریخی پس منظر:

مسئلہ ارتقاء کو چارلس ڈارون (متوفی ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، حالانکہ مختلف قرون کے حکماء نے اس مسئلہ پر بحثیں کی ہیں اور ہر بار متعدد اضافے کئے ہیں۔ اہل یونان اور رومۃ الکبریٰ کے عروج میں اس کے اعتراف کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اہل ہند کی پرانی کتابوں میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ تالیس (التوفی ۵۵۰ق م) امپوڈوکلیز (التوفی ۴۳۵ق م) ہرقلیطس (التوفی ۴۰۵ق م) اور لوقریطس (التوفی ۵۵ق م) نے مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔[1] مسلمانوں نے بھی اس مسئلہ کو لیا۔ امام جاحظ (التوفی ۲۵۵ھ) نے حیوانات پر کافی روشنی ڈالی اور اس کی تشریح کر کے ثبوت بہم پہنچائے کہ ماحول کس طرح حیوانات کے اعضاء اور دیگر خصوصیات میں تبدیلیاں پیدا کر کے ان کو دوسری نوع میں تبدیل کردینے کا باعث بنتا ہے۔ ابونصر محمد الفارابی (التوفی ۳۳۹ھ/۹۵۰) کا اس مسئلہ کی ابتدائی تحقیق وتدوین میں بہت بڑا دخل ہے۔ ابن مسکویہ (التوفی ۳۳۹ھ/۱۰۳۰) نے اسے ایک باقاعدہ اور مرتب نظریئے کی شکل دی۔ الفوزالاصغر اور دوسری تصانیف میں اس مسئلہ کو لیا۔ علامہ اقبالؒ نے ابن مسکویہ کی تحریرات کا خلاصہ پیش کیا ہے جسے ہم ناظرین کی معلومات کیلئے ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

---

[1] وہ معلومات اور نظریات جو محققین نے دو تین ہزار برس کی مشترکہ اور مسلسل کوششوں کے بعد قائم کئے۔ ان ابتدائی سوچنے والوں کے ذہن میں کس طرح آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی قوت متخیلہ عقل ومشاہدہ اور تجربہ واستدلال سے بہت آگے چلتی ہے، معمولی اشاروں سے اس کا تصور کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ عاقل کے لئے اشارہ کافی ہوتا ہے۔ جتنے بڑے بڑے انکشافات ہوئے ہیں ان کی تاریخ پر غور کرو تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کس ایک اشارے سے کسی ذہین آدمی کا ذہن کسی بڑی حقیقت کی طرف منتقل ہوا اور استدلال وتجربہ سے آخر بہت بعد مہیا ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی میں تصور آگے چلتا ہے اور عقل وتجربہ پیچھے پیچھے۔ (داستان دانش از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم) * نعیم صدیقی۔

Marfat.com

"ابن مسکویہ کہتا ہے نباتات کی زندگی پر نظر ڈالیے تو ارتقاء کے اولین مراحل میں نہ تو ان کی پیدائش اور نمو کے لئے بیج کی ضرورت ہوتی ہے نہ اپنی نوع کے تسلسل کے لئے انہیں اس سے کام لینا پڑتا ہے، لہٰذا اس مرحلے پر ہم نباتات کی زندگی اور معدنیات میں یوں فرق کریں گے کہ یہ وہ مرحلہ ہے جس میں نباتات کو تھوڑی بہت طاقت مل جاتی ہے اور پھر اعلیٰ تر انواع کی صورت میں برابر بڑھتی رہتی ہے تا آنکہ اس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ پودے شاخیں نکالتے اور بیجوں کے ذریعے اپنی نوع کا تسلسل قائم رکھتے ہیں، لیکن پھر حرکت کی اس قوت میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہتا ہے، حتیٰ کہ درخت پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کے تنے ہوتے ہیں اور وہ برگ وبار لاتے ہیں۔ اب اس سے بھی آگے بڑھیے۔ نباتات کے ارتقاء کا آئندہ مرحلہ وہ ہے جس میں ایسی انواع کا ظہور ہوگا جن کے لئے زیادہ بہتر زمین اور زیادہ بہتر آب وہوا کی ضرورت ہوگی۔ انگور اور کھجور ارتقائے نباتات کی آخری منزل ہیں جن کے ڈانڈے گویا حیوانی زندگی سے جا ملتے ہیں، چنانچہ کھجور کے اندر جنسی اختلاف بھی صاف طور پر نمایاں ہو جاتا ہے، کیونکہ کھجور میں جڑوں اور ریشوں کے علاوہ وہ شے بھی نشوونما پالیتی ہے جس کا وظیفہ کچھ ایسا ہوتا ہے جیسے دماغ کا، اور جن پر گویا اس کی سلامتی اور حفظ وبقا کا دارومدار ہے۔ یہ نباتات کی زندگی میں ارتقا کا آخری درجہ ہے۔ یا یوں کہیئے کہ حیوانی زندگی کی تمہید۔ حیوانی زندگی کا پہلا قدم پیوستگی سے آزادی ہے جسے گویا شعوری حرکت کی ابتدا سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ اسے حیوانی زندگی کا آغاز کہیئے جس میں اول حس لامسہ اور بالآخر حس باصرہ کا نشوونما ہوتا ہے۔ مگر پھر جب حواس نشوونما حاصل کر لیتے ہیں تو حیوانات نقل وحرکت میں آزاد ہو جاتے ہیں، مثلاً حشرات الارض، رینگنے والے جانور، چیونٹیاں اور شہد کی مکھیاں، چوپایوں میں گھوڑا، حیوانیت کا مظہر اتم ہے اور پرندوں میں عقاب۔ آخر الامر جب بندروں کا ظہور ہوتا ہے حیوانیت گویا انسانیت کے دروازے پر آ کھڑی ہوتی ہے، اس لئے بندر باعتبار ارتقاء انسان سے صرف ایک ہی درجہ پیچھے ہیں۔ ارتقاء کے مزید مراحل میں کچھ اور عضویاتی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جن کے پہلو بہ پہلو انسان کی قوت تمیز اور روحانیت میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے، تا آنکہ وحشت کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور انسان تہذیب وتمدن کی دنیا میں قدم رکھ لیتا ہے۔[1]

---

[1] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، از محمد اقبالؒ

Marfat.com

ان شخصیتوں کے علاوہ ابن سینا (المتوفی ۴۲۹ھ،۱۱۳۷ء) ابن باجہ (۵۳۲ھ،۱۱۳۸ء) عارف رومیؒ (المتوفی ۶۸۲ھ،۱۳۱۴ء) کے نام اس ضمن میں قابل ذکر ہیں۔ میں یہاں عارف رومیؒ کے وہ اشعار پیش کرتا ہوں جوانہوں نے ارتقاء کے سلسلے میں ڈارون سے ساڑھے پانچ سو برس پہلے کہے تھے:

آمدہ اول بہ اقلیم جماد　　از جمادی در نباتاتی اُو فتاد
سالہا اندر نباتی سیر کرد　　وز جمادی یاد ناوزد از نبرد
وزنباتی چوں بہ حیواں اوفتاد　　نامدش حال نباتی ہیچ یاد
جز ہماں میلے کہ داردسوئے آں　　خاصہ دروقت بہار و ضیمراں
ہمچو میل کود کاں با مادراں　　سوئے میل خود ندارد درلباں
باز از حیواں سوئے انسانیش　　مے کشدآں خالقے کہ دانیش
ہم چنیں اقلیم در اقلیم رفت　　تاشد اکنوں عاقل و دانا و زفت
عقلہائے اوّلنشین یاد نیست　　ہم ازیں عقلش تحوّل کردنیست (دفترچہارم)

ممتاز ادیب اور نعت نگار سعید بدر نے ان اشعار کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

""مولانا جلال الدین رومیؒ"" اپنی مشہور زمانہ کتاب ""مثنوی"" کی جلد چہارم کے صفحہ 344 پر ""ابتدائے پیدائش سے آدمی کی پیدائش کے مراتب اور حالات کے بیان"" کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں کہ:

ترجمہ: ""روح انسانی سب سے پہلے جمادات کی اقلیم میں آئی اور اقلیم جمادی سے ترقی کر کے اقلیم نباتات میں منتقل ہوئی۔ اقلیم یعنی خطہ نباتات میں سالہا سال عمر گزاری اور سرکشی کی وجہ سے اپنی جمادی زندگی کو فراموش کر دیا۔ اس کے بعد خطہ نباتات سے حیوانات کی صورت میں تبدیل ہوئی، یہاں بھی سالہا سال بسر ہوئے۔ پھر نباتی زندگانی کے احوال اُسے یاد نہ رہے۔ البتہ موسم بہار اور ضیمران (نازبو) میں میلان پیدا ہو جاتا ہے یعنی بہار کے موسم اور نازبو کے دور میں روح کو نباتات کی یاد آجاتی ہے، اس کی مثال یوں ہے کہ بچے اپنی ماں کی جانب میلان رکھتے ہیں لیکن

Marfat.com

ماں کا دودھ پیتے ہوئے یہ بچے اس میلان کے راز سے بے خبر ہوتے ہیں، اسی طرح نئے مرید کو اپنے بزرگ پیر سے میلان ہوتا ہے۔ وہ اس کی طرف بہت زیادہ متوجہ ہوتا ہے۔ مرید کی جُزوی عقل پیر کی کُلّی عقل کا حصہ ہے، اس سایہ یعنی جزوی عقل کی حرکت پھول کی شاخ یعنی پیر کامل سے ہے اور یہ سایہ بالآخر اس پیر کامل کی شاخ گُل میں فنا ہو جاتا ہے تب اُسے میلان اور جستجو کے راز کا پتہ چل جاتا ہے۔ گویا مرید جب فنافی الشیخ کا مقام حاصل کرتا ہے تو وہ رازِ حیات کو پالیتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ فرع (شاخ) اصل کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اس کے بعد روح اقلیم حیوانات سے انسان (کی پیدائش) کی جانب سفر کرتی ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جو اُسے کھینچتی ہے اور انسان اِسے خوب جانتا ہے۔ روح اسی طرح ایک اقلیم سے دوسری اقلیم، ایک خطہ سے دوسرے خطہ تک چلتی ہے یہاں تک کہ وہ اب عقلمند، دانا اور طاقتور ہوگئی۔ اس کو پہلی عقلیں یاد نہیں رہیں۔ اب اس عقل سے بھی اُسے منتقل ہونا ہے۔"

ایک اور مقام پر حیاتیات ہی کے نقطہ نظر سے انسان کے مستقبل کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ آج بھی ایک تعلیم یافتہ متمدن مسلمان جب ان کے ان اشعار کا مطالعہ کرتا ہے کہ ان کے دل میں مسرت وابتہاج کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔

از جمادی مردم و نامی شدم — وز نما مردم بحیواں سرزدم
مردم از حیوانی و آدم شدم — پس چہ ترسم کے ز مردن کم شدم
حملہ دیگر بمیرم از بشر — تا بز آرم از ملائک بال و پر
بار دیگر از ملک پرّاں شوم — آنچہ اندر وہم ناید آن شوم
پس عدم جو گردم عدم چوں ارغنوں — گویدم کانا الیہ راجعون

یورپ کے حکماء میں سے سربرآوردہ اصحاب کے نام یہ ہیں:

والے (التولد ۱۲۳۸ھ ۱۸۲۳ء) ہکسلے (التوفی ۱۳۱۲ھ ۱۳۹۵ء) ہیکل (التولد ۱۲۵۰ھ ۱۸۳۴ء) ڈارون (التوفی ۱۲۹۹ھ ۱۸۸۲ء) ڈارون کی کتاب اصل الانواع (ORIGIN OF SPECIES) مطبوعہ ۱۲۷۵ھ ۱۸۵۹ء کی شائع ہوئی۔

Marfat.com

مسئلہ ارتقاء کی تین شقیں:

اس مسئلہ کے آخری مراحل چونکہ یورپ کے حکماء بالخصوص چارلس ڈارون کی تحقیق وتدوین کا نتیجہ ہیں اس لئے جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، یہ نظریہ بھی حق وباطل کا مرکب بن گیا ہے۔ اب ہم اس کا تجزیہ کر کے دیکھتے ہیں کہ ان مغربی حکماء کے پیش کردہ نظریہ ارتقاء میں کون سے اجزاء حق کے ہیں اور کون سے باطل کے۔ اس سلسلے میں انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے اس موضوع پر مقالہ نگار نے مسئلہ ارتقاء کو تین اہم شقوں میں تقسیم کر کے ہمارے کام کو آسان بنا دیا ہے۔ فاضل مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ مسئلہ ارتقاء کی تین شقیں ہیں:

اول شق۔ **حقیقت ارتقاء** (Fact of Evolution) یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی ادنیٰ حالتوں سے ترقی کرتی ہوئی بتدریج اعلیٰ حالتوں سے کی طرف پہنچی ہے۔

دوم شق۔ **عوامل ارتقاء** (Method of Evolution) وہ نظام کار (مشینری) کیا ہے جس کے ذریعے ارتقاء واقع ہوتا ہے؟ وہ اصول اور قواعد وضوابط کیا ہیں؟ جو کہ ارتقاء کا باعث بنتے ہیں۔ وہ عوامل ارتقاء کیا ہیں جن کی وجہ سے ارتقاء ہوتا ہے؟

سوم شق۔ **نتیجہ ارتقاء** (Result of Eevolution) کیا ہم ایسے اصول وضوابط معلوم کر سکتے ہیں جو اس امر کی تشریح کر سکیں کہ ارتقاء کا رخ کس طرف ہے؟ یا عمل ارتقاء کے اہم اور واضح رجحانات کی نشاندہی کر سکیں کہ کس طرف کو جا رہا ہے؟ سوم شق کے متعلق فاضل مقالہ نگار لکھتا ہے کہ چونکہ یہ شق فلسفیانہ علم الحیات کے متعلق ہے اسلئے وہ ہمارے لئے خارج از بحث ہے۔[1]

شق اول اور شق دوم کے متعلق فاضل مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ یہ دو علیحدہ علیحدہ شقیں ہیں۔ ایک کی صحت کا انحصار دوسری پر نہیں۔ اگر پہلی شق صحیح ہو تو ضروری نہیں کہ دوسری شق بھی صحیح ہو۔ اگر دوسری شق غلط ہو تو ضروری نہیں کہ پہلی بھی غلط ہو۔ اگر ہم

---

[1] ہم اس کا بیان انشاء اللہ العزیز سورہ فاتحہ کی تفسیر بیان کرتے وقت کریں گے۔

Marfat.com

ایک فعل کے وقوع کا علم رکھتے ہیں تو ضروری نہیں ہمیں یہ بھی علم ہو کہ اس فعل کا وقوع کس طریقہ سے ہوا ہے؟ اگر ہمیں مرغی مرغی کے انڈے کی ان کیمیاوی اور عضویاتی (Physiogical) تبدیلیوں کا علم جو بچے کے وجود میں آنے کا باعث بنتی ہیں، نہ ہو تو اس کے یہ معنی نہیں کہ بچہ مُرغی کے انڈے سے جنم ہی نہیں لیتا؟ یہی مثال مسئلہ ارتقاء پر صادق آتی ہے کہ اگر ہمیں اس کا علم نہ کہ وہ نظام کار کیا ہے جس کے ذریعے ارتقاء واقع ہوتا ہے؟ وہ اصول اور قواعد وضوابط کیا ہیں جو ارتقاء کا باعث بنتے ہیں؟ وہ عوامل کیا ہیں جن کی وجہ سے ارتقاء ہوتا ہے؟ تو اس سے یہ لازم نہیں ارتقاء واقع ہوا ہی نہیں؟ ماہرین علم الحیات اور ماہرین علم طبقات الارض متفق ہیں اور انہوں نے اس امر کے ثبوت کیلئے ناقابل انکار شہادتیں بہم پہنچائی ہیں۔ مسئلہ ارتقاء کے مخالفین یا معترضین جب مخالفت کرتے ہیں وہ اس مسئلہ کی دوم شق میں اگر کوئی خامی پاتے ہیں تو اول شق کے ساتھ اس کو غلط طور پر خلط ملط کر کے ارتقاء کا ہی سرے سے انکار کر دیتے ہیں یہ دراصل ان کی منطق اور ان کے عقلی شعور کی کمزوری کا نتیجہ ہے، حالانکہ دوم شق کے رد کرنے سے اول شق کی کوئی تردید نہیں پائی جاتی وہ اپنی جگہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔[1]

مسئلہ ارتقاء کی شق دوم کے متعلق ڈارون ارتقاء کا باعث (۱) تنازع للبقا (Struggle For Existence) (۲) بقائے اصلح (Survival of the Fittest) (۳) انتخاب طبعی (Natural Selection) کے اصول بتلاتا ہے۔ ڈارون اور اس کے رفقائے کار کے نزدیک کائنات کسی نہ کسی طرح خود بخود وجود میں آ گئی ہے اور یہ اصول بغیر کسی منصوبہ ساز اور حکیم ہستی کے ازخود کام کر رہے ہیں۔ انیسویں صدی میں یورپ میں زندگی اور کائنات کا میکانکی تصور

---

[1] ہم نے فاضل مقالہ نگار کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا اصل مقالہ پڑھنا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ دیکھئے لفظ Evolution انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا جلد ہشتم ایڈیشن ایڈیشن ۱۹۶۹ھ

Marfat.com

(M Nistic Conception) مقبول تھا۔ ڈارون کی اس تشریح نے اسے طاقتور بنا دیا۔ مغرب میں جو نظریئے لادینی اور دہریت کی بنیاد پر قائم کیے گئے، سب اسی کی پیداوار ہیں۔ الحاد اور مادیت کو جتنا فروغ مغرب اور مشرق میں حاصل ہوا سب اسی کی وجہ سے ہوا۔ ہر شعبہ زندگی اور ہر شعبہ علم اس سے بلاواسطہ یا بالواسطہ متاثر ہوا۔ انسان ایک ترقی یافتہ حیوان بن کر رہ گیا۔ علم الاخلاق اور علم الاجتماع میں یہ سرایت کر کے اس نے کئی فتنے برپا کیے۔ زندگی کے ہر پہلو میں "قانون جنگل" (Law of Jungle) پر عمل شروع ہو گیا۔ اس دوم شق اور حیات و کائنات کے میکانکی تصور کی علمی تردید ہم اول شق کو بیان کرنے کے بعد کریں گے کہ اس کی تردید کا وہی اصل مقام ہے۔ یورپ بھی اب زندگی کے میکانکی تصور کر خیر باد کہہ چکا ہے اور دنیائے سائنس کے مشہور سائنس دان کے الفاظ میں:

"دور حاضرہ کے علم طبعیات کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ تمام مادی کائنات سوائے لہروں (Waves) کے اور کچھ نہیں یہ لہریں دو قسم کی ہیں۔ محصور لہریں (Bottld up Waves) جسے ہم مادہ کہتے ہیں اور آزاد لہریں جسے روشنی کہا جاتا ہے۔ فنائے مادہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ ان محصور لہروں کو آزاد کر دیا جائے کہ وہ فضا کی پہنائیوں میں منتشر ہو جائیں۔ ان تصورات کے ماتحت یہ تمام کائنات سمٹ سمٹا کر صرف دنیائے نور رہ جاتی ہے، مضمر یا مشہود۔ اس اعتبار سے تخلیق کائنات کی تمام داستان بالکل صحیح اور مکمل طور پر ان چند الفاظ میں بیان کی جا سکتی ہے کہ خدا نے نور (Light) سے کہا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔" [1]

اور سنیئے پروفیسر مارگن کیا کہتے ہیں:۔

میرا یہ عقیدہ ہے کہ جانداروں میں ارتقائے نفس، اللہ تعالیٰ کی قوت تخلیق و ہدایت (Creative And Directive Power of GOD) کا رہین منت ہے [2]

---

[1] Sir James Jeans the Mysterious Universe

[2] C. Lloyds Morgan: THE GRATE DESIGN

Marfat.com

اس اقتباس میں اللہ تعالیٰ کی قوت تخلیق و ہدایت (Creative And Directive Power of GOD) کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سلسلے میں سورۃ طٰہٰ کی قرآنی آیت کو سامنے لائیے۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی. (طٰہٰ: ۵۰)

موسیٰ نے کہا "ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی پیدائش عطا کی اور پھر اسے کمال تک پہنچنے کی راہ بتائی۔" [1]

اب ہم مسئلہ ارتقاء کی اول شق کی طرف آتے ہیں۔

حقیقت ارتقاء:-

حقائق اس امر کی تائید و تصدیق کرتے ہیں کہ نہ صرف حیاتیاتی سطح پر بلکہ اس سے پہلے مادی کائنات میں بھی ارتقاء واقع ہوتا رہا ہے اور کائنات ایک طویل ارتقائی عمل سے اس قابل ہوئی کہ زندگی کا اس میں ظہور ہو۔ کائنات کے تین درجے کئے جاسکتے ہیں۔

(۱) کائنات کی ابتدائی حالت کے وجود میں آنے سے لے کر اس حالت تک جب وہ اس قابل ہوئی کہ زندگی کا ظہور ہو سکے۔

(۲) زندگی کے اولیں جرثومہ حیات سے لے کر نسل انسانی کے ظہور تک۔

(۳) انسان کے ظہور سے لے کر اس کی ذہنی اور نفسی (Psychic) قوتوں کی تکمیل تک، (انسان اس دور سے گزر رہا ہے۔)

ارتقاء اور قرآن:-

قرآن کی پہلی سورۃ کا آغاز ان لفظوں سے ہوتا ہے۔

---

[1] خلق اور ھدیٰ کے الفاظ پر پھر غور کیجئے۔ مارگن کی (Creative and Directive Power) قرآن کے الفاظ خلق اور ھدیٰ کا بالکل ترجمہ بن گئے۔

Marfat.com

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. (فاتحہ ۱ : ۱)

ترجمہ: ”سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔“

رب اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔

ربوبیت اور تربیت کے معنی کیا ہے؟ آج نہیں بلکہ کئی صدیاں قبل امام راغب اصفہانی نے ”مفردات القرآن“ میں اس کے معنی لکھے ہیں جن کو تمام قدیم و جدید مفسرین بلاامتیاز مسلک و مذہب نقل کرتے چلے آئے ہیں۔

انشا الشی حالاً فحالاً الی حد التمام.

”کسی چیز کو ادنیٰ حالت سے یکے بعد دیگرے اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اعلیٰ حالت تک اس طرح نشو و نما دیتے رہنا کہ اپنی حد کمال تک پہنچ جائے۔“

ربّ کے معنی ہوئے ”ادنیٰ حالتوں سے ترقی دیتے ہوئے بتدریج اعلیٰ حالت تک پہنچانے والا۔“ اور ارتقاء کے معنی بھی یہی ہیں کہ کوئی شے ادنیٰ حالت سے ترقی کر کے بتدریج اعلیٰ حالت تک پہنچ جائے۔ گویا رب العلمین کی ربوبیت کا مظہر ارتقاء ہے۔

تدریج سنت اللہ ہے:-

اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اسے ہر قدرت حاصل ہے کہ کسی چیز کو عدم سے وجود میں لائے، نیست سے ہست کرے۔ لیکن وہ ایسا کرنے میں تدریج سے کام لیتا ہے۔ یہ عمل فی الفور نہیں ہوتا کہ بیج درخت بن جائے یا کاربن ہیرے کی شکل اختیار کرلے یا قطرہ گہر بن جائے یا خوردبینی جرثومہ حیات (Embryo) انسان کے روپ میں نمودار ہو بلکہ انہیں ارتقاء کے تدریجی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس قاعدہ کلیہ سے کائنات کی کوئی شے بھی مستثنیٰ نہیں۔

Marfat.com

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ. (سجدہ ۳۲:۵)

خدا، وہ عظیم و جلیل خدا ہے کہ ایک عالم آرا قانون (اَلْاَمْر) ایک امر مہم (اَلْاَمْر) ایک جلیل القدر معاملے (وَالْاَمْر) کی تجویز آسمان سے زمین تک کر دیتا ہے۔ پھر وہ معاملہ اپنی عظمت اور وسعت کے باعث رفتہ رفتہ اور نامحسوس طور پر ایک مدت مدید میں (فِیْ یَوْمٍ) جس کی مقدار انسانی شمارے کے لحاظ سے ایک ہزار برس ہے یا اس سے بھی زیادہ ہے اس کی مشیت (اِلَیْہِ) کی طرف مسعود کرتا ہے (یَعْرُجُ) اور اپنے اسی زور اثر سے کمال تک پہنچ جاتا ہے (گویا اس کی عظیم الشان تجویزیں ہزاروں برس میں جا کر مکمل ہوتی ہیں، اس کے قانون کا عالم انگیز نفوذ صدیوں میں چل کر محسوس ہوتا ہے، اس کی اٹل مشیت قرنوں کے امتداد کے باوجود پوری ہو رہتی ہے۔)

جب بتدریج سنت اللہ ہے تو یہ کیوں کر ہوسکتا ہے کہ نسل انسانی جس مرحلے پر آج کل ہے، اس کی پہلے کی ادنیٰ حالتیں موجود نہ ہوں۔

کائنات کا تدریجی ظہور:-

کائنات معاً وجود میں نہیں آ گئی۔ بلکہ قرآن کہتا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَيَّامٍ. (سجدہ ۳۲:۴)

ترجمہ: "اللہ وہ ذات ہے جس نے کائنات کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔"

---

۱ اس آیت کا مفہوم سید ابوالاعلیٰ مودودی اس طرح پیش کرتے ہیں۔

زمین کی تدبیر صرف زمین ہی پر نہیں ہو رہی ہے بلکہ وہ ہستی اس نظام کو چلا رہی ہے جو سارے جہان وجود کی ناظم و مدبر ہے۔ اس تدبر کا سررشتہ عالم بالا میں ہے جہاں زمین اور اس کے مختلف النوع معاملات سے متعلق ایک منصوبہ تیار ہوتا ہے۔ کارکنان قضا و قدر اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے پر مامور ہوتے ہیں اور پھر وقتاً فوقتاً اس کے ہر مرحلے کی تکمیل پر اپنی رپورٹ اوپر بھیجتے یا پیش کرتے ہیں۔ اس منصوبے میں ایک ایک مرحلے کی اسکیم بسا اوقات ایک ایک ہزار سال اور پچاس پچاس ہزار سال کی ہوتی ہے۔ ہمارے لئے وہ ایک مدت دراز ہے مگر مدبر کائنات کے ہاں وہ گویا ایک دن کا کام ہے۔

(ترجمان القرآن رجب شعبان ۱۳۷۰ھ اپریل مئی ۱۹۵۱ء بحوالہ رسائل و مسائل حصہ دوم)

Marfat.com

پھراس کے ساتھ ہی یوم کی تشریح فرمائی۔

فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ. (سجدہ ۳۲:۵)

ترجمہ:''ایک دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار برس ہے۔''

یہاں ہزار سال سے مراد ریاضیاتی اعتبار سے عدداً ہزار سال نہیں۔ بلکہ اس سے مراد ایک طویل زمانہ ہے۔ عربی میں ہزار سے اوپر گنتی کیلئے اور الفاظ نہیں ہوتے۔ ہزار سال سے مراد ہزاروں اور لاکھوں برس ہے۔

دوسرے مقام پر الف کی جگہ کالف کا لفظ استعمال کر کے وقت کو غیر محدود کر دیا۔

وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ. (الحج ۲۲:۴۷)

ترجمہ:''اور تمہارے پروردگار کے نزدیک یوم تمہارے شمار کے ایک ہزار برس کی مانند ہوتا ہے۔''

پھر سورۃ معارج میں فرمایا:۔

فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ. (معارج ۷:۴)

ترجمہ:''ایک دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار برس کے برابر ہے۔''

لہذا یوم سے مراد ایک طویل زمانہ[1] ایک دور (Period) ہے جو کہ لاکھوں یا کروڑوں برس کا ہوسکتا ہے اور عقل بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ جب ہمارا نظام شمس وجود ہی میں نہ آیا تھا تو اس زمانے کا وقت اس پیمانہ سے ناپا نہیں جا سکتا جو نظام شمسی کی تخلیق کے بعد زمین کی گردش کی نسبت سے مقرر ہو گیا۔ وقت کی اضافی نوعیت ایک حقیقت ہے۔

قرآن، تورات اور علم کی ہم آہنگی:۔

قرآن نے ارض و سموت کی پیدائش کے چھ ادوار بتائے ہیں۔ سائنس کی موجودہ تحقیق کے اعتبار سے بھی چھ ادوار تسلیم کئے جاتے ہیں اور تورات میں بھی ان چھ دنوں

---

[1] عارف رومی کہتے ہیں ع زیں سحر تا آں سحر سالے ہزار ترجمہ:''اس صبح سے اُس صبح تک ہزاروں سال کی مدت ہے۔''

Marfat.com

(ادوار) میں سے ہر دن دور کی پیدائش کی تفصیل بھی موجود ہے۔

''خدا نے ابتداء میں زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی۔ اور خدا نے کہا روشنی ہو جا اور روشنی ہو گئی۔ اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے۔ اور خدا نے روشنی کو تاریکی سے جدا کیا۔ اور خدا نے روشنی کو تو دن کہا اور تاریکی کو رات اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو پہلا دن ہوا۔''

''اور خدا نے کہا کہ پانیوں کے درمیان فضا ہو تاکہ پانی پانی سے جدا ہو جائے۔ پس خدا نے فضا کو بنایا اور فضا کے نیچے کے پانی کو فضا کے اوپر کے پانی سے جدا کیا اور ایسا ہی ہوا۔ اور خدا نے فضا کو آسمان کہا اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو دوسرا دن ہوا۔''

''اور خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے کا پانی ایک جگہ جمع ہو کر خشکی نظر آئے اور ایسا ہی ہوا۔ اور خدا نے خشکی کو زمین کہا اور جو پانی جمع ہو گیا تھا اس کو سمندر اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے۔ اور خدا نے کہا کہ زمین گھاس اور بیج دار بوٹیوں کو اور پھلدار درختوں کو جو اپنی اپنی جنس کے موافق پھلیں اور جو زمین پر اپنے آپ ہی میں بیج رکھیں، اگائے اور ایسا ہی ہوا۔ تب زمین نے گھاس اور بوٹیوں کو جو اپنی اپنی جنس کے موافق بیج رکھیں اور پھلدار درختوں کو جن کے بیج ان کی جنس کے موافق ان میں ہیں اگایا اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے۔ اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو تیسرا دن ہوا۔''

''اور خدا نے کہا کہ فلک پر نیّر ہوں کہ دن کو رات سے الگ کریں اور وہ نشانوں اور زمانوں اور دنوں اور برسوں کے امتیاز کیلئے ہوں اور وہ فلک پر انوار کیلئے ہوں کہ زمین پر روشنی ڈالیں اور ایسا ہی ہوا۔ اور سو خدا نے دو بڑے نیر بنائے۔ ایک نیر اکبر کہ دن پر حکومت کرے اور ایک نیر اصغر جو رات پر حکومت کرے اور اس نے ستاروں کو بھی بنایا۔ اور خدائے ان کو فلک پر رکھا کہ زمین پر روشنی ڈالیں۔ اور دن پر اور رات پر حکم کریں اور اجالے کو اندھیرے سے جدا کریں اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے اور شام ہوئی اور صبح ہوئی سو چوتھا دن ہوا۔

اور خدا نے کہا کہ پانی جانداروں کو کثرت سے پیدا کرے اور پرندے زمین کے اوپر فضا میں اڑیں۔ اور خدا نے بڑے بڑے دریائی جانوروں کو اور ہر قسم کے جاندار جو پانی سے بکثرت پیدا ہوئے تھے ان کی جنس کے موافق اور ہر قسم کے پرندوں کو ان کی جنس کے موافق پیدا کیا اور خدا

Marfat.com

نے دیکھا کہ اچھا ہے اور خدا نے ان کو یہ کہہ کے برکت دی کہ پھلو اور بڑھو اور ان سمندروں کے پانی کو بھر دو۔ اور پرندے زمین پر بہت بڑھ جائیں اور شام ہوئی اور صبح ہوئی، سو پانچواں دن ہوا۔

اور خدا نے کہا زمین جانداروں کو ان کی جنس کے موافق چوپائے اور رینگنے والے جاندار اور جنگلی جانور ان کی جنس کے موافق پیدا کرے اور ایسا ہی ہوا۔ اور خدا نے جنگلی جانوروں اور چوپایوں کو ان کی جنس کے موافق اور زمین پر رینگنے والے جانداروں کو ان کی جنس کے موافق بنایا اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے پھر خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی شبیہہ کی مانند بنائیں اور وہ سمندر کی مچھلیوں اور آسمان کے پرندوں اور چوپایوں اور تمام زمین اور سب جانداروں پر جو زمین پر رینگتے ہیں اختیار رکھیں۔ اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ خدا کی صورت پر اس کو پیدا کیا۔ نر و ناری ان کو پیدا کئے۔ اور خدا نے ان کو برکت دی اور کہا چلو اور بڑھو اور زمین کو معمور و محکوم کرو۔ اور سمندر کی مچھلیوں اور ہوا کے پرندوں اور کل جانوروں پر جو زمین پر چلتے ہیں اختیار رکھو۔ اور خدا نے کہا دیکھو میں تمام روئے زمین کی کل بیج دار سبزی اور ہر درخت جس میں اس کا بیج دار پھل ہو تم کو دیتا ہوں، یہ تمہارے کھانے کو ہوں۔ اور زمین کے کل جانوروں کیلئے اور ہوا کے کل پرندوں کیلئے اور ان سب کیلئے جو زمین پر رینگنے والے ہیں۔ جن میں زندگی کا دم ہے۔ کل ہری بوٹیاں کھانے کو تیار ہوں۔ اور ایسا ہی ہوا اور خدا نے سب پر جو اس نے بنایا تھا نظر کی اور دیکھا کہ بہت اچھا ہے۔ اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو چھٹا دن ہوا۔" (پیدائش باب اول آیات ۱ تا ۲۶)

پیدائش سموات:-

ارض و سموات تخلیق کائنات کے وقت ایک تھے۔ یہ تمام لانتہا کرّے بشمولیت زمین پیدائش کے وقت [1] باہم ملے ہوئے تھے۔

---

[1] جب ارض و سموات باہم ملے ہوئے تھے اس وقت "سما" تھا۔ اس سما کا ادین مولیٰ بنولی (Nabulae) (سحاب نور) ہے جن کے متعلق سر آلیور لاج (Sir Oliver Lodge) لکھتا ہے: مواد کے یہ طویل و عریض ٹکڑے ضخیم ادلوں یا گیس کے منطقوں کی صورت میں جمع ہو جاتے ہیں۔ جنہیں ہم سحاب نور (Nabulae) کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ ان کو بجا طور پر گیس یا دھواں کہنا چاہیئے۔ کیونکہ دھوئیں یا گیس کی اصلیت یہ ہے کہ اس میں مادہ کے بکھرے ہوئے اجزا ایک دوسرے سے الگ تھلگ ادھر ادھر حرکت کرتے رہتے ہیں"۔ قرآن حکیم میں ہے، ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ (حٰم سجدہ ۴۱:۱۱) اور وہ سما کی طرف متوجہ ہوا جو ایک دھواں تھا۔

Marfat.com

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ. (انبیا ۲۱ : ۳۰)

ترجمہ: ”اے پیغمبر! کیا منکرین نے اس حقیقت پر نظر نہیں کی کہ لاانتہا کرّے اور زمین شروع میں باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو الگ الگ کر دیا اور ہر ذی حیات چیز کو پانی سے پیدا کیا۔ تو کیا یہ لوگ اب بھی ایمان نہیں لاتے؟“

ایک دھماکا[1] (Explosion) ہوا۔ اور اس کُل کے پھٹنے سے اس کے ہزاروں اجزا فضا میں انتہائی دوری پر پھیل گئے اور بڑے بڑے شموس (جمع شمس کی) وجود میں آئے۔ یہ شموس تمام سیارات کے وجود کا سرچشمہ ہیں۔ قانون اشتعال کی بنا پر یہ اجرام بڑے بڑے دہکتے ہوئے ٹکڑے بڑے زور سے اچھالتے ہیں۔ یہ ٹکڑے تھوڑی دور جا کر پھر ان میں آ گرتے ہیں۔ یہ اجرام پھر ان کو اچھالتے ہیں اور وہ پہلی مرتبہ کی طرح پھر واپس آ گرتے ہیں۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ یہ اجرام اپنے محور پر گردش کرتے رہتے ہیں۔ اس حالت میں کبھی کوئی ایسا واقعہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے کوئی ٹکڑا ان اجسام سے نکل جاتا ہے اور پھر ان میں واپس نہیں آتا۔ اس وقت اس ٹکڑے کے گرد ایک مخصوص دائرہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ دائرہ مستقل ہو کر اس دائرہ میں بلا انقطاع گردش کرنے لگتا ہے۔

---

[1] اللہ تعالیٰ کا متعین کردہ ایک قانون کائنات کا یہ بھی ہے کہ جب ایک چیز باہر اور اندر سے ارتقاء کے مراحل طے کر کے تکمیل اور پختگی کو پہنچتی ہے تو باہر سے پھٹ جاتی ہے اور اندر والی چیز مزید ارتقاء حاصل کرنے کیلئے باہر نکلتی ہے۔ اس پھٹنے کو ”انفلاق“ کہتے ہیں۔ بیج اور گٹھلی میں بھی یہی عمل جاری ہے۔ بیج جب اندر سے پختگی کی حالت میں باہر نکلتا ہے تو اس کا باہر غلاف چیخ کر پھٹ جاتا ہے۔ گٹھلی کی بھی یہی حالت ہے۔ پھر درخت کے ہر مرحلے پر یہی حالت طاری رہتی ہے شاخ پھوٹتی ہے جب پتہ نکلنے کا وقت ہوتا ہے تو پتہ شاخ سے پھوٹتا ہے۔ پھل اور پھول بھی اسی طرح پھوٹتے ہیں۔ اس کے متعلق فرمایا: فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی، (انعام ۶:۹۵) ترجمہ: ”دانے اور گٹھلی کا پھاڑنے والا“ پھوٹتے وقت اس چیز کی حیثیت کے مطابق یہ آواز پیدا ہوتی ہے۔ ابتدائے آفرینش کے وقت جب ارض و سموات باہم ملے ہوئے تھے ایک ہی ہیولیٰ تھا۔ جب باہر اور اندر سے تکمیل و پختگی ہوئی تو پھٹ گیا تاکہ اندر کی چیز باہر نکل کر مزید ارتقاء حاصل کر سکے۔ اس پھٹنے سے دھماکا ہوا، کسی چیز کو باہر اور اندر کو ارتقاء دے کر تکمیل و پختگی تک پہنچانا، پھٹنے اور پھوٹنے کی صلاحیت پیدا کرنا اور وقت مناسب پر اس صلاحیت کو فعلیت میں لانے والی جو عظیم ہستی ہے۔ یہ ہے رَبِّ الْفَلَقِ (الفلق ۱۱۳:۱)

Marfat.com

زمین کی پیدائش:-

تمام سیارات کی طرح زمین بھی آفتاب کے جسم کا ایک ٹکڑا تھی۔ اس کے انفصال و انقطاع کی صورت بھی وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ اس کو بھی دیگر سیاروں کی طرح بڑے زور سے اچھال کر دور پھینکا گیا۔

قرآن حکیم میں ہے۔

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا (نازیات ۷۹: ۳۰)

ترجمہ: ''اور زمین کو اس کے بعد پھینکا اور اسے ہموار کیا۔'' [1]

اسی طرح کرہ ارض کا جداگانہ وجود عمل میں آیا اور اس میں مزید تغیرات اس طرح ہوئے کہ ابتداء انقطاع میں یہ شعلہ مجسم تھا۔ فضائے محض میں گردش کا اقتضاء یہ تھا کہ اس کی حرارت نکلے۔ خروج حرارت کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جسم میں برودت پیدا ہو۔ برودت اپنے ساتھ انجماد لاتی ہے۔ چنانچہ جب اس کی حرارت نکلی تو اس میں انجماد شروع ہوا اور اس سیال کرے کے بالائی حصے پر ایک سطح منجمد قشری [2] تیار ہوگئی۔ یہ قشر باریک تھا اور اس مواد سے تیار ہوا تھا جو پگھلے ہوئے بہتے پھرتے تھے۔ یہی قشر یا سطح منجمد زمین کا طبق اُولیٰ کہلاتی ہے۔

طبقہ اُولیٰ کے نیچے ایک آتشکدہ تھا کہ برابر جل رہا تھا۔ بخارات پیدا ہوئے اور اس طبقہ کے مسامات کی راہ سے نکل کر بلند ہوگئے اوپر جا کر ابر بنے اور پانی برسنا شروع ہوا۔ اس پانی نے جمع ہو کر سمندر کی صورت اختیار کر لی۔ پانی ہی سے زندگی نمودار ہوئی۔ اوپر والی آیت ۲۱: ۳۰ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زندگی پانی سے نمودار ہو کر پھیلی۔

---

[1] دَحو کے معنی پھینکنے کے بھی ہیں (لسان العرب) اور پھیلانے و بچھانے کے بھی (تاج) پہلے اسے پھینکا گیا پھر اس کے اوپر سطح پیدا کی گئی جو زمین کا طبقہ اولیٰ کہلاتی ہے۔

[2] انجماد قشری یعنی ایسا انجماد جس پر چھلکے کی طرح بالائی غلاف ہو۔

Marfat.com

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْئٍ حَيٍّ. (الانبیا۔ ۳۰)

ترجمہ: ''اور ہر ذی حیات چیز کو پانی سے پیدا کیا۔''

کنکسلے کہتا ہے کہ:-

''سمندر کا پانی تمام جانداروں کی ماں ہے۔''

پھر اس زندگی میں تنوع پیدا ہوا اور تمام آبی مخلوقات پھیلی اور پھولتی رہیں اس وقت اللہ تعالیٰ کی حکومت پانی پر نافذ تھی۔

وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ. (ھود ۱۱:۷)

ترجمہ: ''اور خدا کی حکومت پانی پر تھی۔''

جسم انسان کی ابتداء:-

پانی اور مٹی کا امتزاج ہوا۔ مٹی پہلے اس شکل میں تھی جو آگ سے نکلی ہوئی ہو۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ زمین، سورج کا حصہ ہونے کی وجہ سے شعلہ مجسم تھی۔ اس کے بالائی حصے پر ایک سطح منجمد قشری تیار ہو گئی۔ قرآن نے زمین کی اس حالت کو صَلْصَالٍ (الحجر ۱۵:۲۶) اور صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (رحمٰن ۵۵:۱۴) کی حالت سے تعبیر کیا ہے۔ صَلْصَالٍ کے معنی آگ میں سڑی ہوئی مٹی کے ہیں۔ یہ صَلَّى اللعم اور اَصَلَّ کے محاورہ سے مشتق ہے۔ صَلْصَالٍ اصل میں صلال ہے۔ ایک لام کو ''صاد'' میں بدل دیا (امام راغب) فَخَّارِ بھی اس مٹی کو کہتے ہیں جو آگ سے پک کر نکلی ہو۔ برتن جو آگ سے پک کر نکلتا ہے، بجتا ہے۔ کچی مٹی سے نہیں بجتا۔ اگر بجانے کی کوشش کریں تو ہاتھ لگانے ہی سے ٹوٹ جاتا ہے۔

پھر جب اس کے اوپر پانی جمع ہو گیا تو طین لازب (الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۱) لیسدار کیچڑ بن گئی۔ لیسدار کیچڑ کی اس حالت میں سالہا سال گذر گئے۔ پھر خمیر پیدا ہو کر سیاہ ہو گیا۔ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (الحجر ۱۵ : ۲۶) کی تعبیر اس حالت کی ہے۔ لیس دار سیاہ کیچڑ

Marfat.com

سے جو تالاب، جوہڑ یا جھیل کے کنارے نظر آتا ہے ایک جوہر تیار ہوا جو جامد عناصر کا مرکب ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ. (المومنون ۲۳:۱۲)

اس مادہ سے جرثومہ اولیں کی پیدائش ہوئی۔ نفس واحدہ کا ظہور ہوا۔ یہ جرثومہ حیات واحد الخلیہ تھا۔ کل ذی حیات مخلوق اسی نفس واحد کے اجتماع اور استعمار سے ہوئی اور قرن ہا قرن میں اپنی ارتقائی استعداد کے باعث ایک حالت سے دوسری حالت، ایک جائے قرار سے دوسری جائے قرار میں منتقل ہو کر اپنے اپنے مقام پر پہنچی۔ قرآن حکیم میں ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ. قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ. (الانعام ۶ : ۹۹)

''خداوہ خلاق عظیم ہے کہ تم جیسے اشرف الخلق وجود کی ابتدا اور اس کی نشاء اوّل ایک نفس مطلق سے کی (اَنْشَاَكُمْ) پھر اُس نفس وحدہ کو ایک عارضی جائے قرار اور مکان استقرار (فَمُسْتَقَرٌّ) سے دوسری جائے قرار میں منتقل کیا۔ حتی کہ اسے آخری مکان قرار اور مستقل جائے (مُسْتَوْدَعٌ)[1] میں لے آیا جو احسن الخلق بشر کا قالب ہے۔ جو قوم ہمارے اعمال کو سمجھتی ہو اس کا صحیح علم رکھتی ہے اس قوم پر اپنی قدرت کی یہ نشانیاں ان لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں۔''

---

[1] المستودع ودع یدع۔ ودع کے معنی ہے کسی چیز کا ٹھہر جانا یا قرار پا جانا (اَلْوَدِيْعَة امانت جو کسی کے پاس حفاظت کیلئے رکھی جائے۔ المستودع وہ مقام یہاں کوئی چیز رکھ دی جائے کہ وہ قرار پا یا جائے یا ٹھہر جائے (تاج ومحیط) آیت میں مستقر اور مستودع کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ارتقاء کا یہ اصول ہے کہ جب کوئی چیز بتدریج یا فجائی طریقے سے دوسری شکل اختیار کرتی ہے تو پہلے ایک حالت میں ہوتی ہے اس حالت سے ارتقاء کر کے دوسری حالت میں پہنچتی ہے، پھر اس کے بعد ارتقاء کر کے تیسری حالت میں حتی کہ آگے بڑھتی ہوئی منزل بمنزل اپنی تکمیل کو پہنچ جاتی ہے۔ ہر حالت اور ہر منزل کا نام مستقر ہے یہاں ایک جائے قرار سے دوسرے جائے قرار میں مستقل ہوتی رہتی ہے۔ اور جہاں آخری حالت میں پہنچتی ہے اور ٹھہر جاتی ہے۔ وہ مستودع ہے۔ انسانی قلب کی موجودہ حالت مستودع ہے اور اس سے قبل کی ہر حالت مستقر کی حالت تھی۔

Marfat.com

نفس کا لفظ نہایت ہی معنی خیز ہے جس کے معنی مطلق جان کے ہیں۔قرآن حکیم میں انسان کی پیدائش کے متعلق نفس واحدہ کا ذکر ہے بشر واحدہ کا ذکر کہیں نہیں۔[1]

افزائش نسل:-

جسد انسانی کی اولین صورت ایک خلیہ (Cell) پر مشتمل تھی۔ شروع میں افزائش نسل کا طریقہ یہ ہے کہ خلیہ کا مرکزی مواد (Neucles) طوالت اختیار کر کے خود بخود دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔

رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّجَعَلَ مِنْھَا زَوْجَھَا.

ترجمہ: "تم کو ایک نفس واحدہ سے پیدا کیا اور اس سے تمہارا جوڑا بنایا۔"

رگ وید باب اہم منتر ۱۲۱ میں ہے:-

"سچائی سے دنیا کی تخلیق ہوئی۔ پہلے پانی پیدا ہوا، پانی سے نر کی تولید ہوئی۔ پھر نر دو حصوں میں بٹ گیا اور اس سے اس کی مادہ نکلی۔"

اس خوردبینی نفس واحدہ سے سلسلہ تخلیق آگے بڑھایا گیا۔ یہ سلسلہ افزائش غیر جنسی (Aserual) طریقہ پر تھا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ پھر اس کو مختلف منازل اور مراحل طے کرائے گئے۔ یہاں تک تخلیق کا سلسلہ بذریعہ جنس (Sex) شروع ہوا۔

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ. (سجدہ ۳۲:۸)

ترجمہ: "پھر[2] ہم نے اس کی نسل کو حقیر پانی کے نچوڑ سے بنایا۔"

---

[1] یہ چیز حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر کے منافی نہیں۔ یہ ان سے بہت پہلے کے واقعات ہیں۔ اس کی تشریح (سورہ بقرہ کی آیات نمبر ۲۶ تا ۳۹) میں آئے گی۔

[2] یہ آیات جو پیش کی جا رہی ہیں قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر پھیلی ہوئی نہیں ہیں یہ آیات مسلسل ہیں۔ البتہ ان آیات کی تشریح میں مختلف آیات بھی پیش کی گئی ہیں۔ لیکن انسان کے ارتقاء کے سلسلے میں آیات باہم مسلسل ہیں۔ آخر میں ان آیات کو اکٹھا کر کے ایک مقام پر ان کا مربوط ترجمہ کر دیا جائے گا۔

Marfat.com

ایک اہم وضاحت:-

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے۔ کہ انسان ابتدا میں اور اپنے ارتقاء کے مختلف مراحل میں کبھی بھی ''حیوان'' نہیں تھا۔ اس نے ارتقاء کے مختلف مراحل طے کئے۔ لیکن بذات خود شروع سے انسان کی شکل اختیار کرنے کیلئے بنایا گیا تھا۔ وہ جونک نما تھا۔ جونک کا ارتقاء اپنی امکانی استعداد کے کمال تک پہنچ کر خود رک گیا۔ انسان ان تمام مراحل سے گذرتا آگے بڑھتا گیا۔ وہ حیوان نما تھا۔ لیکن حیوان نہیں تھا۔ اس کی کل شکل وصورت اور خصوصیات دیگر حیوانات سے ملتی جلتی بھی تھیں اور ان سے مختلف بھی تھیں۔ اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت تمام حیوانات سے زیادہ تھی۔ دوسرے حیوانات اپنی اپنی امکانی استعداد کو بالفعل حاصل کر کے رکتے گئے لیکن یہ بالقوۃ انسان سے بالفعل انسان ہوتا چلا گیا اور چلا جار ہا ہے۔ جب وہ واحد الخُلیہ تھا تو بھی بالقوۃ انسان تھا۔ بالفعل انسان ہونے کی طرف آگے قدم بڑھایا۔ ارتقاء کے مختلف مراحل اور منازل طے کرتا چلا گیا۔ ہر مرحلہ اور ہر منزل تخلق وتطور کی نوعیت میں ظاہر ہوئی اور ہر تطور ایک نئی پیدائش کا حکم رکھتا تھا۔ اس کی مثال بعینہ ایسے ہے جس طرح کہ جنین (Embryo) شروع میں جب عورت کے رحم میں ہوتا ہے تو انسان کے جنین ایک درخت، ایک مچھلی، ایک پرند، ایک چار پائے کے جنین کے مشابہ ہوتا ہے پھر جب وہ ترقی کرتا ہے تو صرف حیوانات کے جنین کی مانند ہوتا ہے۔ پھر وہ حیوانات لبونہ کی اعلیٰ جنس کے جنین کی طرح ہوتا ہے پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جنین اور انسان کے جنین کی مشابہت حیران کن ہوتی ہے۔ لیکن ان تمام مراحل میں وہ جنین انسان ہی کا جنین ہوتا ہے اور اس جنین کے اندر انسان بننے کی صلاحیت شروع ہی سے موجود ہوتی ہے۔ ہر حالت میں یکے بعد دیگرے تطورات طاری ہوتے ہیں اور ہر تطور ایک نئی پیدائش کا حکم رکھتا ہے۔ لیکن ان مراحل میں وہ جنین انسان کا جنین ہوتا ہے اور اس جنین میں انسان بننے کی صلاحیت شروع ہی سے موجود ہوتی ہے۔ درخت کے

Marfat.com

جنین سے درخت کا پودا بن جاتا ہے۔اس میں اور تطورات طاری نہیں ہوتے۔حیوان کا جنین پہلے درخت کے جنین کے مشابہ ہوتا ہے۔پھر حیوانی جنین بنتا ہے۔اس کے بعد اس پر تطورات طاری نہیں ہوتے اور وہ حیوان کا بچہ بن جاتا ہے۔اُن کی صلاحیت ہی یہی بننے کی ہوتی ہے۔انسانی جنین نباتاتی اور حیوانی جنین سے بھی مشابہ ہوتا ہے اور مختلف بھی۔ [1]

میں بتا یہ رہا تھا کہ انسان جب واحد الخلیہ تھا وہ بالقوۃ انسان ہی تھا اور انسان ہی کی شکل و خصوصیات اختیار کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔وہ بالفعل انسان بنتا چلا گیا اور چلا جا رہا ہے۔یہ سب کچھ ایک منصوبہ کے تحت سرانجام پایا اور منصوبہ ساز ایک حکیم وعلیم ہستی ہے صاحب [2] ”صحیفۃ التکوین“ بھی یہی کچھ کہتے ہیں۔

در اروپا ڈارون فرزانۂ — لیک از دین خدا بیگانۂ
کرد او انکار ذات کبریا — گفت از خود کرد عالم ارتقاء
درخیالش قردہ بود انس جلیل — مرتقی شد، یافت ایں شکل جمیل
گفتہ اُو را نسازی حرز جاں — نیست انسان ہرگز از بوزینہ گان
قربت انسان با بوزینہ نیست — بین این در رشتہ دیرینہ نیست
قبل انسان خود دو پایان قدیم — داشتند از قردگاں فرق عظیم
گرچہ اوعاری زدین و نطق بود — از اشارت رائے خود ظاہر نمود
ساختے ازسنگ اُورا از سلاح — نار او را داد از سردی فلاح
مثل بوزینہ اگر گوئی بجا است — لیک خود بوزینہ گفتن ناروا است

”صحیفۃ التکوین“ میں ناصر الملک سابق والئی چترال نے اس معاملہ پر بہتر انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے جس کا ترجمہ ممتاز ادیب سعید بدر نے یوں کیا ہے:

---

[1] اس کی مزید تشریح کے لئے دیکھو صفحہ 174 تا 183

[2] محمدؐ ناصر الملک مرحوم سابق والئی چترال نے ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی ہے جس میں مسئلہ ارتقاء اور دوسرے علمی مسائل کو بیان کیا ہے۔اس کتاب کا نام ”صحیفۃ التکوین“ ہے۔

Marfat.com

''صحیفۃ التکوین'' میں ناصر الملک سابق والئی چترال نے اس معاملہ پر بہتر انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے جس کا ترجمہ ممتاز ادیب سعید بدر نے یوں کیا ہے:

''یورپ میں ڈارون نامی دانشور ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کے دین سے دور اور بیگانہ تھا۔ (گویا بھٹکا ہوا تھا) اس نے ذات کبریا سے انکار کر دیا اور دعویٰ کیا کہ یہ عالم ازخود وجود میں آیا ہے، اس کے خیال یا نظریہ کے مطابق انسان ''بندر'' تھا اور اُس نے خود ہی ارتقاء کے ذریعے موجودہ شکل (انسانی) اختیار کر لی۔ صاحب ''صحیفۃ التکوین'' فرماتے ہیں کہ اس مغربی دانشور کے (نظریہ) کو حرزِ جاں نہ بنائیں اور ہرگز تسلیم نہ کریں کیونکہ انسان بندروں کی نسل سے پیدا نہیں ہوا، انسان کی قربت بندروں سے ہرگز نہیں اور ان کے درمیان کوئی تعلق یا پُرانا رشتہ موجود نہیں، انسان کی شکل اختیار کرنے سے عہد قدیم میں ''دوپائے'' ضرور موجود تھے جو قروگان سے فرق رکھتے تھے گویا مختلف تھے۔ ڈارون چونکہ دین سے بیگانہ تھا، اسلئے وہ ''اشارات'' کو سمجھ نہ سکا۔ انسان نے اس کی پیدائش پتھر اور لوہے سے قرار دیدی اور کہا کہ آگ نے اس کو سردی سے پناہ دی۔ اگر وہ کہتا کہ انسان موجودہ شکل اختیار کرنے سے قبل ''بندر کی مانند'' تھا تو درست ہے لیکن یہ کہنا کہ وہ ''بندر'' تھا تو یہ سراسر غلط ہے۔''

اوپر والی بحث تو بعض امور کی وضاحت کیلئے آ گئی۔ اب ہم اصل موضوع کی طرف واپس آتے ہیں جہاں سے چھوڑا تھا کہ

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مُّهِيْنٍ. (سجدہ ۲۲ : ۸)

ترجمہ: ''پھر ہم نے اس کی نسل کو حقیر پانی کے نچوڑ سے بنایا۔''

اس مرحلے پر انسان اور دوسرے حیوانات کی افزائش کا سلسلہ بذریعہ تخلیق آگے بڑھتا گیا۔

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى اَرْبَعٍ. (النور ۲۴ : ۴۵)

ترجمہ: ''اور اللہ نے روئے زمین کے تمام حیوانوں کو ایک ہی نُطفے اور ایک ہی سلسلہ توالد و تناسل کے ذریعے سے (مِّنْ مَّآءٍ) پیدا کیا ان میں سے وہ ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو صرف دو پاؤں پر چلتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو چار پاؤں پر چلتے ہیں۔''

Marfat.com

انسان بھی حیوان نما حالت میں موجود تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جس کے متعلق فرمایا کہ اس زمانہ میں وہ قابل ذکر "شئی" نہ تھا۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا. (دهر ۷۶ : ۱)

ترجمہ: "کیا انسان پر زمانے کا وہ وقت نہیں گذرا جب کہ وہ قابل ذکر شے نہیں تھا۔"

یعنی موجود تو تھا۔ لیکن اس کی دوسرے حیوانات کے مقابلے میں امتیازی حیثیت نہیں تھی کہ وہ قابل ذکر شئی ہوتا۔

ایک درجہ اوپر ہوا اور کرہ ارض پر ایک نئی مخلوق ظاہر ہوئی۔

ایک نئی مخلوق :-

انسان ارتقاء کے مختلف مراحل طے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ہر مرحلہ تخلیق وتطور کی نوعیت میں ظاہر ہوا۔ ہر تطور نئی پیدائش کا حکم رکھتا تھا۔ اب وہ وقت آ گیا کہ تطور اور تحول سے ایک ایسی نئی پیدائش ہو جو پہلی پیدائشوں سے یکسر مختلف ہو۔ اس تخلق سے جو قریبی پہلے کی حالت تھی اس کے متعلق فرمایا ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ. (سجدہ ۳۲:۸) اس کے بعد ثُمَّ سَوّٰهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (سجدہ ۳۲:۹) کے مراحل سامنے آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا تسویہ فرمایا اور نفخ روح کے عمل سے الوہیاتی توانائی کا ایک جز اس میں پھونک دیا۔ اس مقام پر ایک نئی منزل سامنے آ جاتی ہے جب نفخ روح کا عمل ہوا تو معاً فرمایا: جعل لکم السمع والابصار والافئدۃ اور تم کو سمع، بصر اور ذہن عطا فرمائے۔ پہلے نَسْلَهٗ، سَوّٰهُ اور فِيْهِ میں هُوَ کا ضمیر استعمال ہوا لیکن تنفیخ روح کے بعد لَكُمْ میں ضمیر مخاطب کی ہوگئی۔ هُوَ کا ضمیر انسان کی پہلی حالتوں (جو عضویاتی ارتقاء کے مختلف مراحل میں ہیں) کی طرف ہے اور لکم میں موجودہ حالت کی طرف جب کہ انسان سمع، بصرہ اور نور کی نعمتوں سے سرفراز کیا گیا۔ یہ نیا عنصر ایک جدید اضافہ ہے جو کہ تنفیخ روح کے نتیجہ میں اسے عطا کیا

Marfat.com

گیا۔ ارتقاء کا یہ مرحلہ تحول فجائی (Mutation) کے ذریعے ہوا جس سے انسان ایک خود شعور (Self Concious) ہستی بن گیا۔ صاحب ارادہ و اختیار بنا۔ مسجود ملائک ہوا۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان سلسلہ ارتقاء کی سابق کڑیوں سے ایک منفرد اور قطعاً مختلف [1] حیثیت کا مالک ہوا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس کا سابقہ کڑیوں سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

تم تو شباب آتے ہی کچھ اور ہو گئے
بدلے کچھ ایسے طور سے بے طور ہو گئے

اب انسان ایک محض ترقی یافتہ حیوان نہ رہا بلکہ حیوانات سے الگ کچھ اور ہو گیا۔ ہمارے زمانے کا ایک ماہر ارتقاء لکھتا ہے:۔

''اس حقیقت کا اعتراف کرنا نہایت ضروری ہے کہ انسان ایک حیوان تو ہے لیکن اس کی ہستی کی انفرادیت کی بنیاد وہ خصوصیات ہیں جن میں کوئی اور حیوان اس کا شریک نہیں۔ فطرت نے انسان کا مقام اور اس مقام کی بلند ترین اہمیت انسان کی حیوانیت کی وجہ سے نہیں، اس کی انسانیت کی وجہ سے ہے.......... انسان ایک بالکل نئی قسم کا حیوان ہے۔ ایک ایسا حیوان جس میں اگرچہ طبیعی ارتقاء کا سلسلہ بھی جاری ہے لیکن اس میں ایک بالکل نئی قسم کا ارتقاء بھی نمودار ہو رہا ہے۔'' [2]

ایڈنگٹن (Eddington) اس بارے میں لکھتا ہے:۔

''ہم نے پیشتر یہاں تک بحث کی ہے کہ بجلی کے ذرات کس طرح سمٹ سمٹا کر انسانی پیکر کی صورت اختیار کر گئے۔ لیکن ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ انسان ان عناصر سے جن کے متعلق پہلے بحث کی جا چکی ہے۔ بالکل مختلف اور جداگانہ شے ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شعور نے ارتقائی منازل طے نہیں کیں.......... لیکن جب زندگی شعور کے ساتھ متمتک ہو جاتی ہے تو ہم بالکل ایک جداگانہ دنیا میں جا پہنچتے ہیں۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں طبیعیات اور کیمیا کے اصول اسی

---

[1] انسان اس مرحلے پر ''تو'' کہلانے کا مستحق ہو گیا۔ اس کو ''مخاطب'' کیا جا سکتا ہے۔ کم کی ضمیر کی اہمیت اس سے واضح ہوتی ہے۔ حیوانات کو مخاطب نہیں کیا جا سکتا۔ اس منزل پر پہنچ کر یہ کن کن صلاحیتوں کا حامل ہو گیا۔ اس کیلئے Buber کی کتاب I & Thou کا مطالعہ کیجئے۔

[2] Simpson : THE MEANING OF EVOLUTION.

Marfat.com

طرح ناکام رہ جاتے ہیں جس طرح یہ کوشش کہ انسانوں کی جماعت پر گرامر کے قواعد وضوابط کی مانند قوانین سے حکومت کی ہے۔"[1]

اب ایک قدم آگے بڑھیئے۔ برگسان (Bergson) لکھتا ہے:۔ "جس بنیادی غلطی نے ارسطو سے لے کر آج تک فلسفہ فطرت کو مکدر کر رکھا ہے، وہ یہ ہے، کہ اس فلسفہ کی رو سے نباتی احساس، حیوانی جبلت اور انسانی شعور کو ایک ہی میلان (Tendency) کے تین درجے تسلیم کیا جاتا ہے۔"

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک عمل کی تین مختلف شاخیں ہیں جو ایک دوسرے سے یکسر الگ ہیں۔ ان میں باہمی فرق تو درجات کا ہے اور نہ ہی شدت (Intension) کا۔ ان میں نوعی فرق (Difference of Kind) ہے۔"[2]

اب اس مقام کے متعلق جو نفخ روح کے عمل سے انسان کو عطا ہوا، فجائی ارتقاء (Emergent Evolution) کے امام پروفیسر لائڈ مارگن کی زبانی سنیئے:۔

"میں اپنے اس عقیدہ کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس ارتقاء کو ایک نفس اعلیٰ (Supreme Mind) کا مظہر یا عکس سمجھنا چاہیئے۔ وہ نفس اعلیٰ جو ان تمام اشیا کا خالق ہے، جسے ہم جدید سے تعبیر کرتے ہیں۔ میں اس ارتقائے نفس کے اندر ہی دیکھتا ہوں کہ اوپر سے نیچے اور اول سے آخر تک ایک عظیم الشان سکیم (تدبیر) عمل پیرا ہے۔ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ فطرت کی ہر شے میں یہ ارتقائی بالیدگی، خدائی عاملیت (Divine Agency) کا ہی مظاہرہ ہے اور چونکہ اس سلسلہ ارتقاء میں نفس انسانی بلند ترین مقام ہے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ارتقائے نفس اس "نفس اعلیٰ" کی عاملیت کا آئینہ ہے۔ لیکن یہ "نفس اعلیٰ" لامحدود اور زمان کی قیود سے بے نیاز ہے۔ اس کی ذات کے لئے "اول" اور "آخر"، "جدت" اور "اعادۃ" کے الفاظ ان معانی میں استعمال نہیں کئے جا سکتے جن معانی میں یہ نفس انسانی سے بحث کرتے وقت استعمال ہوتے ہیں ---------

---

1. Eddington : SCIENCE AND THE UNSEEN WORLD
2. Bergson : CREATIVE EVOLUTION

Marfat.com

---------وہ روح خلق جو قدیم اور ارتقاء کی پیداوار نہیں بلکہ وہ ایسی ذات ہے کہ خود ارتقاء کی بڑھتی ہوئی صورت اس کا پرتو ہے۔[1]

ویسے تو

''یہ کائنات ہر قسم کے انتشار کے باوجود خدا کا تدریجی مظہر ہے''۔[2]

علامہ اقبال کہتے ہیں:۔ یہ کائنات اپنی تمام تفاصیل کے ساتھ مادی ایٹم کی میکانکی حرکت سے لے کر نفس انسانی میں فکر کی آزاد حرکت تک سب کا سب کیا ہے؟ اس 'انائے اکبر' کا انکشاف ذات (تشکیل جدید)

اس خارجی کائنات میں خدا کے مثبت پروگرام کی تکمیل طوعاً و کرہاً ہو رہی ہے۔ لیکن اس انسانی مقام پر جس کا ذکر ہم اس وقت کر رہے ہیں، انسان چونکہ صاحب ارادہ و اختیار بن جاتا ہے تو اس پروگرام کی تکمیل میں جب اپنے ارادہ و اختیار سے سرگرم ہوتا ہے تو خدا اور بندے میں باہمی رفاقت کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں:۔

''اس ارتقائی تبدیلی کے طریق و نہج میں خدا خود بندے کا رفیق بن جاتا ہے بشرطیکہ انسان اس باب میں پہل کرے''۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ.[3]

''لیکن انسان اگر اس بات میں پہل نہیں کرتا۔ اگر وہ اپنی خودی کی مخفی قوتوں کو بروئے کار نہیں لاتا، اگر وہ ابھرنے والی زندگی کے اندرونی تلاطم کا احساس نہیں کرتا تو اس کی روح پتھر کی قساوت اختیار کر لیتی ہے اور وہ انسان نہیں رہتا بلکہ جامد مادہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔''[4]

اب وہ آیات پیش کی جاتی ہیں جو ہمارے اس موضوع کا محور رہی ہیں۔ آپ دیکھ لیں گے کہ لاکھوں اور کروڑوں برس کی طویل داستان چند جملوں کے اندر اس طرح سمٹ کر رہ گئی ہے۔

---

[1] C. Lloyd Morgan : The Great Design.

[2] Haldane : The Philosophical Basis of Biology.

[3] (الرعد ۱۳:۱۱)　　[4] تشکیل جدید

Marfat.com

ے فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے۔

سورہ سجدہ میں ہے:-

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ مَالَکُمْ مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا شَفِیْعٍ اَفَلَا تَتَذَکَّرُوْنَ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ذٰلِکَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ الَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْئٍ خَلَقَہٗ وَبَدَاَخَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَہٗ مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّھِیْنٍ ط ثُمَّ سَوّٰہُ وَنَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِہٖ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ. (سجدہ ۲۲ : ۹.۴)

ترجمہ: "لوگو! خداوہ عظیم وجلیل خدا ہے جس نے ارض وسموات کو چھ بڑے مدید الوقت اور طویل المیعاد دنوں میں پیدا کیا اور تخت سلطنت پر جا بیٹھا اس ادارت عظمٰی کو چلا رہا ہے۔لوگو! اس کے سوا نہ تمہارا کوئی کارساز ہے نہ سفارشی،اس کی حکومت ہر جا چل رہی ہے۔اس کا قانون ہر جگہ جاری و ساری ہے، کیا تم لوگ اس کارخانہ کائنات اور اس عالم آرا حکومت سے سبق حاصل نہیں کرتے۔"

وہ،وہ عظیم کار اور بزرگ اعمال خدا ہے کہ ایک عالم آرا قانون (اَلْاَمْر) ایک امر مہم (اَلْاَمْر) ایک جلیل القدر فیصلے یا معاملے (اَلْاَمْر) کی تجویز آسمان سے لے کر زمین تک کر دیتا ہے۔پھر وہ معاملہ،اپنی عظمت اور وسعت کے باعث،رفتہ رفتہ اور نامحسوس طور پر،ایک مدت مدید میں (فِیْ یَوْمٍ) جس کی مقدار انسانی شمار کے لحاظ سے ہزاروں اور لاکھوں برس سے بھی زیادہ ہے۔اس کی مشیت کی طرف (اِلَیْہِ) صعود کرتا ہے (یَعْرُجُ) اور اپنے اٹل زور اثر سے کمال کو پہنچ جاتا ہے! (گویا اس کی عظیم الشان تجویزیں ہزاروں لاکھوں برس مین جا کر مکمل ہوتی ہیں۔اس کے قانون کا عالم انگیز نفوذ صدیوں میں چل کر محسوس ہوتا ہے) یہ ہے وہ ہزاروں لاکھوں برس کے بعد کے حالات کا علم رکھنے والا (عٰلِمُ الْغَیْبِ) اور آج کے حال و احوال کا صحیح پرکھنے والا

Marfat.com

(وَالشَّهَادَةِ) غالب القوی (اَلْعَزِیْزُ) صاحب رحمت خدا جس کے رحم، تحمل اور کمال علم وعمل پر کائنات کا نظام چل رہا ہے۔

وہ، وہ صنّاع عظیم ہے جس نے ہر پیدا کردہ شے کو بہتر سے بہتر کر دیا ہے، اور انسان جیسی اشرف الخلق مخلوق کی ابتد (بَدَا) مٹی کی حقیر اور کم تر مخلوق سے کی۔ پھر رفتہ رفتہ اس بداء اول، اس کم تر مخلوق، اور اس خلق قدیم کی نسل کو ہزار ہا برس کی تدبیر اور تشکیل نوع کے بعد مادہ تناسل سے، جو حقیر سا پانی کا نچوڑ ہے، جاری رکھا۔ پھر تناسل کے اس عظیم الشان مرحلے کو طے کرنے کے بعد اس خلق جدید کے اعضا میں، ہزار ہا برس کی مزید تجویز وتدبیر کے بعد بہترین تناسب قائم کیا (ثُمَّ سَوّٰهُ) اور پھر اس احسن الخلق شے میں اس خدائے عزیز و رحیم نے اپنی ناپید امثال صفات اور اوصاف واخلاق کا ایک شمہ ڈالا۔ اس کو اپنی جانب سے تھوڑا سا علم تھوڑی قدرت، تھوڑی سی سمجھ وغیرہ عطا فرما کر اپنی روح اس میں پھونک دی (وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ) اور آج اے اشرف الخلق انسانو! اس نے تم کو ان تمام مرحلوں سے گزار کر وہ عظیم الشان نعمائے الٰہی اور اوصاف کبریا کے وہ عدیم المثال مظاہر عطا کیے ہیں جن کا نام کان ہے، آنکھ ہے اور ذہن ہے جن کے ذریعے تم صحیح معنوں میں (سب کم تر مخلوق کے نقلی کانوں، آنکھوں اور ذہن سے قطع نظر سن سکتے ہو، دیکھ سکتے ہو اور سمجھ سکتے ہو۔ افسوس کہ تم ان حیرت انگیز نعمتوں کی بہت ہی کم قدر کرتے ہو، اور ان کو بہت ہی کم صحیح استعمال میں لاتے ہو۔ (قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ).

شجر ارتقاء:-

یہ ہے انسان کی داستان کہ کس طرح حیات کا جرثومہ اولین بتدریج ترقی کے مختلف منازل اور مراحل طے کرتا اس حالت میں پہنچا کہ خدا کا رفیق بننے کی صلاحیت

Marfat.com

اس میں پیدا ہوگئی۔ ارتقاء ایک شجر ہے جو جرثومہ اولین سے چھوٹا ہے جس کی متعدد متفرع شاخیں ہیں مگر اصل ایک ہی ہے۔ مختلف شاخیں پھیلتی اور پھولتی ہیں، بلکہ شاخ در شاخ بن گئیں۔ ان پر مختلف پھول لگے جو اس نوع کی صالح ترین انواع تھی۔ ہر شاخ اپنی ترقی کے ایک خاص مرحلہ پر پہنچ کر رک گئی۔ بہت سی شاخیں اور پتے جھڑ بھی گئے جو غیر صالح انواع کی مصداق ہیں۔ لیکن ایک شاخ برابر آگے بڑھتی گئی۔ یہ بلند ترین شاخ انسان ہے، سورۃ نوح میں ہے:۔

وَاللّٰهُ اَنۡبَتَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ نَبَاتًا۔ (نوح ۷۱:۱۷)

ترجمہ: ''اے ساکنان زمین! خدائے عظیم نے تم کو زمین سے ایک درخت کی طرح اُگایا۔''

اس آیت سے تین آیات قبل حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم سے خطاب ہے۔ تمام آیات کو اکٹھا ملا کر پڑھیے۔

مَا لَكُمۡ لَا تَرۡجُوۡنَ لِلّٰهِ وَقَارًا وَقَدۡ خَلَقَكُمۡ اَطۡوَارًا۔ (نوح ۷۱ : ۱۳۔۱۴)

ترجمہ: ''اے لوگو! تمھیں کیا ہوگیا کہ تم خدائے عظیم کے عزت و وقار کے آرزو مند نہیں ہوتے حالانکہ وہی رب بے مثال تو ہے جس نے تم کو تخلیق کی کئی حالتوں اور کئی مرتبوں سے مرتقی کر کے پیدا کیا۔ ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت میں ترقی دے کر انسان ہونے کا وقار بخشا۔ اب بھی اگر اللہ تعالیٰ سے عزت وقار کی آس لگاؤ گے تو تمھیں عزت وقار کے بلند مقام پر فائز کرے گا۔''[1]

---

[1] وقاراً اور اطوراً والی آیات کا ربط ترجمہ میں واضح کیا گیا ہے۔ پھر آیت ۱۷ کو پیش نظر رکھیے۔ ایک اور مقام پر فرمایا ھوالذی انشاکم من الارض (ہود:۶۱) اللہ وہ پاک ذات ہے جس نے تمھیں زمین سے پیدا کیا۔ اس آیت کا مضمون انسان کے ارتقاء کے تصور سے مناسبت رکھتا ہے اور انسانِ اوّل کے براہ راست وجود میں آنے یا کہیں سے زمین ہونے کی تردید ہے اس آیت اور اوپر والی آیات میں نشو (پیدا ہونے اور بڑھنے) اور نبت (اُگنے) کے الفاظ قابل غور ہیں۔ کُمْ سے مراد تمام نسل انسانی ہے۔

Marfat.com

علوم کی تائید:-

انسانی علم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس نے مسئلہ ارتقاء کی تائید و تثبیت نہ کی ہو۔ علم طبقات الارض، علم الجبال، علم افلاک، علم الجنین، علم رکازات، ریاضیات، معدومیات، عضویات سب اس کی مساعدت میں ہیں۔ ہم صرف یہاں ان دو علوم کو اس مسئلہ کی تائید میں یہاں پیش کرتے ہیں جس سے ناظرین کی دلچسپی ہوسکتی ہے۔ ایک معدومیات (Plaintology) اور دوسرے علم الجنین (Embryology)

طبقات الارض کی تہوں میں میلوں کی گہرائی پر دبی ہوئی ہڈیاں نہ صرف اس مخلوق کی یاد ہیں جو آج سے ہزار ہا لکھوکھا برس پہلے اس زمین پر بس رہی تھی لیکن اب معدوم ہو چکی ہے، بلکہ زمین کے ان طبیعی اور جغرافی، مقامی او رتخلیقی انقلابات کی سلسلہ وار سرگذشت ہیں جو نشاء آفرینش سے ہوئے اور آج ہو رہے ہیں۔ گویا زمین کے تہ در تہ طبقے کتاب ''فطرت کے مرتب اوراق اور ان کی ہڈیاں وہ ''نا قابل محو حروف'' ہیں جن کی وساطت سے ماجرائے زمین کا سلسلہ وار پتہ لگ سکتا ہے۔ اسفل طبقے اعلیٰ طبقوں سے لامحالہ قدیم تر ہیں اور ان کے باقی ماندہ[1] آثار تکوین کے تدریجی سلسلے کی صحیح سند ہیں۔ سطح زمین کا وہ حصہ جو انسان کے دست قدرت میں ہے اور جہاں تک اس کی کدال کی نہ پہنچ سکتی ہے، دو قسم کے احجار پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ جو نسبتاً مختصر سا ہے ان چٹانوں کا ہے جو وقتاً فوقتاً زمین کے بطن سے سیال حالت میں آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں سے نکل کر سطح زمین پر جمتی گئیں اور بعد ازاں اس جُملی نداب کے عظیم الشان تودے بن گئے۔ یہ سب چٹانیں نہایت سخت ہیں، ان کی زمین پر پھیلاؤ کی کوئی ترتیب نہیں، ان کے اندر کسی قدیم حیوان کے بقیہ آثار کا نشان تک نہیں جہاں جہاں غلاف کا کوئی کمزور حصہ ہے وہاں یہ چٹانیں اس کو پھاڑ کر نمودار ہوگئی ہیں۔

---

[1] سطح زمین کی عمیق تہوں میں مخلوقات قدیمہ کے آثار باقیہ کو طبقات الارض کی عملی اصطلاح میں ''رکازنہ'' کہتے ہیں۔

Marfat.com

قدامت کے لحاظ سے ان کی ترکیب میں کچھ کچھ کیمیاوی تغیر وتبدل ہوا ہے مگر ماہر فن کیلئے ان احجار منقلبہ کی شناخت کچھ مشکل نہیں اور اگر کوئی شے مشتبہ نظر آئے تو خوردبین اس کا یکدم فیصلہ کر دیتی ہے۔

دوسری قسم چٹانوں کی وہ ہے جو مطبق یعنی تہ در تہ ہے۔ ایک تہ نہایت سلیقے سے دوسری تہ کے اوپر جمی ہے۔ ان کی سطحیں بھی قریب قریب ہموار ہیں۔ ہر ایک تہ کا رنگ اس کے ادنی اجزاء اس کی ظاہری ساخت، اس کی خوردبینی بافت اور کیمیاوی ترکیب دوسری تہ سے جدا ہے، کوئی نرم ہے، کوئی سخت ہے، کسی کے اجزا نہایت باریک ذرات سے بنے ہیں، کسی میں چھوٹے چھوٹے ساحل آب کے گھسے ہوئے پتھر جڑ کر چٹان بن گئے ہیں، کسی کے سالمات اس قدر نفیس ہیں کہ بمشکل تمام ان کے اتصال کو شناخت کیا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ سورہ فاطر میں اپنی حیرت انگیز اور جلیل الشان چٹانوں کی طرف اشارہ ہے جن کی حقیقت کشا سرگذشت کم بین اور کوتاہ نظر انسان نے ہزاروں برس تک سننے سے انکار کیا اور ابھی ڈیڑھ سو برس نہیں گذرے کہ مغرب کے چند مغربی حکما اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر ان سے ہمکلام ہوئے اور ان کی جگ بیتی داستان کو سن کر ایک عالم کو محو کر دیا۔

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ۔ (فاطر ۳۵ : ۲۷)

اے ساکنان زمین! کیا تم نے اس حیرت انگیز حقیقت پر غور نہیں کیا (الم تر) کا ترجمہ جو اس آیت کریمہ کے شروع میں ہے، کہ پہاڑوں کے اندر عظیم الشان طبقے ہیں جن میں سے کوئی سفید ہے، کوئی سرخ، ان کے رنگ جدا جدا ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو بھجنگ کالے ہیں۔

ان طبقوں کی متوازی حدیں ان کی ہموار سطحیں، ان کی ظاہری ساخت اور خوردبینی بافت، ان کے مختلف اور متقابل رنگ لامحالہ اس نتیجے پر پہنچا دیتے ہیں کہ یہ سب احجار، پانی کی تہ میں، اور سمندروں کی وساطت سے بنے۔ سطح زمین کے مختلف

Marfat.com

نالوں اور دریاؤں کے مکدر اور ذرات آمیز پانی جھیلوں اور سمندروں کے پانی میں مل کر ساکن ہو گئے۔ وہاں پر آہستہ آہستہ ان کی تلچھٹیں (رسوبات) تہوں میں بیٹھتی گئیں اور مرور وقت کے باعث ہزارہا موٹی تہیں بن گئیں۔ ایک تہ کے اوپر سطح زمین کے تبدیلیٔ احوال کے باعث، دوسرے رنگ، ساخت اور قماش کی تہ بیٹھی۔ تبدیلی موسم، طوفان بادو خاک، اور حرکت انہار کے تخریبی اثرات **(تعریہ جوّی)** شبنم اور طبیعی میاہ، باران و یخ بستہ کے کیمیاوی اور اداراتی اعمال (تعریہ فطری اور تصادم امواج و مدو جزر بحر کی زمینی شکست و ریخت (تعریہ بحری) نے ان طبقات کی تدریجی تعمیر میں مستقل حصہ لیا۔ پھر ان کے اوپر کا پانی زلازل زمین (زمین کے زلزلے) یا اور مقامی انقلابات کے باعث خشک ہو گیا اور یہ طبقے سطح زمین پر نمودار ہو گئے۔ بعد ازاں اوپر کے طبقوں کے کروڑوں من بوجھ اور زمین کی اندرونی عمارت نے قرنوں کے بعد ان رسوبات کو پتھر کی مانند سخت کر دیا اور مختلف چٹانیں بن گئیں۔ آج بھی ہر سمندر، جھیل بلکہ معمولی تالابوں کی تہوں میں یہ رسوبی طبقات روز بروز بن رہے ہیں اور ہر صاحب نظر کو ارضی تعمیر و شکست کا سبق دے رہے ہیں۔

لیکن جو حیرت انگیز امتیاز ان آبی اور ترسیبی احجار میں نمایاں ہے وہ ان کا حیوانی ہڈیوں اور ڈھانچوں، ان کے قدموں کے نشانوں اور نباتی پتوں اور تنوں کے بعد آثار (رکازات) سے معمور ہونا ہے۔ سطح زمین سے کئی کئی ہزار گز بلکہ بعض اوقات چار چار میل نیچے تک یہ ہڈیاں کیمیاوی طور پر تبدیل شدہ حالت میں ملتی ہیں۔ بلند ترین طبقوں میں مرے ہوئے حیوانوں کے سالم ڈھانچے ترکیبی اجزا کے معمولی ردوبدل کے بعد پائے جاتے ہیں۔ ان کی شکلیں بالکل محفوظ ہیں لیکن اجزا متحجّر یا متحدّد بن گئے ہیں۔ بعض کے اجزا چونے میں مل گئے ہیں، بعض لوہا یا تانبا وغیرہ بن چکے ہیں۔ قرآن حکیم میں عظام کی اس بدل ماہیت کی طرف علیمانہ اشارہ کر کے خدا فراموش انسانوں کو بعث کا عبرت انگیز سبق دیا گیا ہے:-

Marfat.com

وَقَالُوٓا ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ، فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا. (بنی اسرائیل ۱۱ : ۴۹۔۵۱)

ترجمہ: ''اور لوگ کہتے ہیں کہ جب مرے پیچھے گل سڑ کر ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ایسی حالت میں ہم کو از سر نو پیدا کر کے اٹھا کر کھڑا کیا جائے گا۔ اے محمد ﷺ! ان سے کہہ دو تم مرے پیچھے پتھر اجاؤ، یا لوہا بن جاؤ یا کوئی اور شے جو تمہارے خیال میں اس سے بھی عجیب تر ہو کہ اچھا بھلا اب کون ہم کو زندہ کر سکے گا انہیں کہہ دو کہ وہی خلاق عظیم جس نے تمہیں پہلے پیدا کیا تھا۔ اس پر یہ لوگ تمہارے سامنے انکار کے طور پر سر ہلانے لگیں گے اور کہیں گے کہ اچھا یہ کب ہوگا؟ انہیں کہہ دو کہ عجب نہیں کہ یہ سب کچھ قریب ہی آن لگا ہو۔

ایک مدت تک ان آثار باقیہ کے متعلق لوگ یونہی سر ہلایا کیے۔ ان کے وجود کے بارے میں اکثر اغماضی اور تجاہلی شان رہی۔ لوگ ان کو دیکھتے، مگر ان کے متعلق بحث کرنے سے محترز رہتے۔ کسی نے ان کو فطرت کا کھیل کہا، کسی نے خدا کی شان کا نمونہ بتا کر معترض کو چپ کرا دیا۔ عیسائی پادریوں نے جو یورپ کی عملی تحقیقات سے خوفزدہ ہو کر اپنی انجیل کی حفاظت میں حواس باختہ تھے اور پاپائے رومتہ الکبریٰ نے جو محافظ دین ہونے کی حیثیت میں علمائے فطرت کو دار و صلیب پر چڑھانے میں مصروف تھا۔ ان کو نوح علیہ السلام کے طوفان کا بقیہ قرار دے کر اپنی جان چھڑانی چاہی۔ مگر حقیقت کے بالمقابل باطل کب تک ٹھہر سکتا تھا۔ جب کئی کئی گز لمبے ڈھانچے اور پورے سر، پیر اور دھڑ برآمد ہونے لگے اور میلوں کی گہرائی تک تمام سطح زمین آباد نظر آئی تو پادری دم دبا کر بھاگے۔ سب مسیحی یورپ دم بخود ہو گیا۔ علمائے فطرت کی چڑھ بنی۔ انہوں نے کامل غور و خوض کے بعد اعلان کر دیا کہ دنیا عہد عتیق کے شمار کے مطابق چھ ہزار سال سے ہی آباد نہیں بلکہ تخلیق کا سلسلہ لکھو کہا برس سے جاری ہے۔ یہ ہڈیاں

Marfat.com

لامحالہ ان حیوانوں کی ہیں جو روئے زمین پر انسان سے پہلے بس رہے تھے۔ان کے ڈھانچے پانی کے سیلاب، ہوا کے جھکڑ یا اور مختلف اسباب کے ذریعے سے سمندروں میں چلے گئے۔آبی حیوانوں کے ڈھانچے وہیں تہ میں گرتے ہے۔ بالآخر جب رفتہ رفتہ رسوبات اور ذرات کی تہ ان پر جمی وہ دب گئے۔فطرت نے ان کو نہایت حفاظت سے یادگار کے طور پر محفوظ رکھا، ان کی شکلیں برقرار رکھیں، ان کے کیمیاوی اجزا تقطیر حوامض واملاح کے باعث بدل گئے مگر شکل نہ بدل سکی۔انسان اپنی موجودہ شکل میں ان حیوانات کے مدتوں بعد آیا اور یہ سب بتدریج ہوا۔اس بنا پر سطح زمین کے لاتعداد رنگارنگ طبقے فطرت کی عظیم الشان کتاب کے رنگارنگ ورق ہیں، یہ رکازات باقیہ ان اوراق پر خدا کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے ''حروف'' ہیں۔انسان کو یہ عالم آرا کتاب اسلئے دی گئی ہے کہ اس کو پڑھے اور اس خلاق عظیم کی عظمت کا اندازہ بچشم خود کرے۔

کتاب فطرت کی اس حیرت انگیز اہمیت کو پیش نظر رکھ کر مغرب کے طبیعی حکمانے احجار، زمین کے اس حصہ عظمیٰ کو جن کی تخلیق سمندر کی وساطت سے ہوئی، پانچ بڑے اور طویل المدت زمانوں یعنی **''القدیمہ الاولی''**، **''القدیمہ الاخریٰ''**، **''الحیات الوسطیٰ''**، **''الجدیدۃ القصویٰ''** اور **''الجدیدۃ الاولی''** کے طور پر منقسم کیا ہے۔پہلی قسم یعنی القدیمۃ الاولی کے طبقوں میں جن کی گہرائی زمین کے بعض حصوں میں میلوں تک پہنچی ہے اور جو اور سب طبق کی تہ میں ہیں، کسی ذی حیات مخلوق کا باقی نشان آج تک نہیں ملا۔اگرچہ ان کی تہوں کے اندر بعض مشکوک سی لکیریں اور سوراخ پائے جاتے ہیں جن سے شبہ پڑتا ہے کہ وہ کسی بے استخواں حشرات الارض کے نشانات قدم ہیں، باقی چار حصے حیرت انگیز ترتیب اور **تسلسل** کے ساتھ عجیب وغریب حیوانات کے بقیہ آثار رکازات سے پر ہیں۔سطح زمین کا کوئی حصہ ان سے خالی نہیں۔''القدیمہ الاخریٰ'' کے پہلے حصے میں زندگی صرف **غیر ذیفقری** اور مفصلی مخلوق تک محدود رہی۔دوسرے اور تیسرے حصے میں ان بے استخوان اور مضغہ وش حشرات سے ریڑھ

Marfat.com

کی ہڈی والے (ذیفقری) بے دست و پا جانور پیدا ہوئے جن کی نشاء اول مچھلی سے ہوئی، چوتھے اور پانچویں حصوں میں مچھلیوں کا اعضائی ارتقاء اوج کمال کو پہنچا۔ چھٹے حصے میں پر دار مچھلی کے ساتھ پیٹ کے بل چلنے والے دابہ کا ظہور ہوا ''الحیات الوسطیٰ'' میں بے دست و پا مچھلی اور دابہ سے پر دپا دار پرندوں کا ارتقاء ہوا۔ پھر ''الجدیدة القصویٰ'' کے زمانے میں دو پاؤں والے پرندوں اور حرازیں (چھپکلیوں) کے ارتقاء سے چار ٹانگوں والے **''ذات الثدیٰ حیوان''** پیدا ہوئے جو اس سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ ان انواع کا مقدمہ الجیش ''الحیات الوسطیٰ'' کے ادنی طبق میں نمودار ہو گیا تھا۔ طبیعی حکما کا اندازہ ہے کہ یہ تمام نوعی اور جنسی تبدیلیاں لاکھوں بلکہ کروڑوں برس میں جا کر واقع ہوئیں اور بتدقیق تمام ہوئیں، ادنیٰ مخلوق ہی بلند تر طبقوں میں اسی ایک سلسلہ **توالد و تناسل** کے ذریعے سے وقتاً فوقتاً اعلیٰ مخلوق میں تبدیل ہوتی رہی۔ قرآن حکیم میں سورۂ نور میں حیوانات زمین کی اس وحدت **اصل و نسل** کو اور **جوارح حیوانی** کے اس **تدریجی** اور **سلسلہ وار انقلاب** کو ان غیر مشکوک، پر معنی اور نتیجہ خیز بینات میں ادا کیا ہے جن کے حقیقت کشا انکشاف کو صحیفہ فطرت میں بچشم خود دیکھ کر خدا کی طاقت کا ہر شخص کے مشخص ہو جانا نہیں بلکہ تخلیق عالم اور سر حیات کے متعلق **صراط مستقیم** کا پتہ لگ جانا یقینی ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ[1] فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ. يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ط وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ. (النور ۲۴:۴۵)

ترجمہ: ''اور لوگو! اس خلاق عظیم کی طاقت کی یہ شان ہے کہ اس نے روئے زمین کے تمام حیوانوں کو ایک ہی نطفے اور ایک ہی سلسلہ توالد و تناسل کے ذریعے سے (مِنْ مَّآءٍ) پیدا کیا۔ ان حیوانوں

---

[1] کل کی تعمیم ماء کی تنکیر و تنوین اور خلق کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ یہاں مراد ایک سلسلہ تناسل ہے (۲۱:۳۰) کا الماء مراد نہیں۔

Marfat.com

میں بعض وہ ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو صرف دو پاؤں پر چلتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو چار پاؤں پر چلتے ہیں۔لوگو! خدا جو شے جس کے ذریعے سے مناسب سمجھتا ہے پیدا کرتا ہے وہ ہر بات کے کر دینے پر قادر ہے۔اے ساکنان زمین! ہم نے تم کو علم اور کوتاہ نظر انسانوں پر حقیقت کشا اور جہاں نما آیات اتاری ہیں تاکہ تم پر تکوین حیات کا راز بین ہو جائے اور یاد رکھو کہ خدائے عظیم اسی کو علم کے صراط مستقیم پر لے جاتا ہے جس کو مناسب سمجھتا ہے۔" [1]

علم الجنین کی تائید:۔

علم الحیات کا ایک اصول ہے جس کا مطلب ہے۔فرد کا جنین رحم کے اندر اپنی نسل کا اعادہ کرتا ہے۔ [2] یعنی فرد اپنی نسل کی تاریخ کو دہراتا ہے۔جو تطورات و تحوّلات اس کی نسل پر نہ آئے۔وہی تطورات اور تحولات رحم کے اندر اس پر طاری ہوتے ہیں۔فرد کی پیدائش کے سلسلے میں سورۃ المومنون ۲۳ میں ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ. (المومنون ۲۳ : ۱۴.۱۲)

ترجمہ: "اور دیکھو! یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا (یعنی زندگی کی ابتدا مٹی کے خلاصہ سے ہوئی۔ پھر ہم نے اسے نطفہ بنایا ایک ٹھہر جانے اور جمانے کی جگہ میں۔ پھر "نطفہ" کو ہم نے "علقہ" بنایا پھر "علقہ" کو ایک گوشت کا ٹکڑا سا کر دیا۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ پیدا کیا۔ پھر ڈھانچے پر گوشت کی تہ چڑھا دی پھر دیکھو کس طرح اسے بالکل ایک دوسری ہی طرح کی مخلوق بنا کر نمودار کیا؟ کیا ہی برکتوں والی ہستی ہے اللہ کی۔ پیدا کرنے والوں میں سب سے بہتر پیدا کرنے والا۔"

---

[1] پانچوں طبقات میں جو مخلوق موجود تھی اس کی حیران کن مفصل تشریح کیلئے علامہ عنایت اللہ خان المشرقی کا تذکرہ جلد اول دیکھئے۔ یہ اقتباس بھی وہیں سے لیا گیا ہے۔

[2] Ontogeny Repeats Phylogony

Marfat.com

اس آیت کی تشریح ابوالکلام آزاد کے قلم سے پیش کی جاتی ہے۔اس آیت کی اس سے بہتر تشریح اس وقت تک کہیں موجود نہیں۔

جدید تحقیقات:-

قبل اس کے قرآن کے بیان کردہ مراتب پر نظر ڈالی جائے، معلوم کر لینا چاہئے کہ انسانی وجود کی پیدائش اور اس کے جنین کے احوال و تطوّرات کے باب میں علم کے حقائق کیا ہیں؟ یہ مبحث بہ تفصیل مقدمہ میں ملے گا۔ یہاں مختصراً اشارات کریں گے۔

تمام حیوانات کی طرح انسان کی پیدائش بھی ایک بیضہ سے ہوئی جسے اصطلاح میں Ovum کہتے ہیں۔ یعنی خلیہ تخم (خلیہ یعنی (Cell)) یہ خلیہ تخم جنس اناث میں بھی پیدا ہوتا ہے اور جنس رجال میں بھی۔ فعل تمتیع اس وقت واقع ہوتا ہے جب جنس رجال کے خلیات تخم جنس اُناث کے بیضہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ خلیہ تخم ایک بہت ہی رقیق ذرّہ کا سا حجم رکھتا ہے۔ یعنی اس کا قطر ایک انچ کا سو بیسواں حصہ بلکہ اس سے بھی کم ہوتا ہے۔ یہی خلیہ زندگی اور وجود کا اصلی تخم ہے۔

نطفہ کے قرار پانے کے معنی یہ ہیں کہ جنس رجال کا خلیہ تخم جنس اناث کے بیض میں جگہ پا جائے۔ استقرار کے بعد جنین کا تطور شروع ہوتا ہے۔ ابتداء میں وہ محض خُلیات کا ایک کردی مجموعہ ہوتا ہے۔ پھر ایک مجوّف گیند کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کے اطراف کی دیوار خُلیّات سے مرکب ہوتی ہے۔ اس کے بعد خُلیات ایک دوسرے سے بالکل مل جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ ان میں طولانیت پیدا ہونی شروع ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بالکل ایک نعل نما (Sole Shaped) صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اب ان میں ایک ایسی ہیکلی ہیئت پیدا ہوتی ہے جیسی مچھلی کی ہوتی ہے۔ پھر یہ ہیئت حیوانات قوازب ا (Amphibia) کا سا ہیکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے بعد حیوانات لبونہ (Mammals) کا ہیکل نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن پہلے ادنی درجہ کے حیوانات لبونہ کا۔ مثلاً ایسا جیسا آسٹریلیا کے خلد آبی (Duck Bill) کا ہوتا ہے۔ یا ان حیوانات کا جنہیں ذوات الکیس (Marsupile) کہتے ہیں۔ پھر اونچے درجہ کے حیوانات لبونہ کا۔ مثلاً گھوڑا، کتا، بیل، پھر یہ مرتبہ ترقی کر کے ایک ایسے ہیکل تک پہنچتا ہے جو ٹھیک بندر کا سا ہوتا

Marfat.com

ہے۔ دم بھی موجود ہوتی ہے۔ پھر اس میں تبدیلی شروع ہوتی ہے اور بندر کے ترقی یافتہ اعلیٰ اقسام کا سا ہیکل نمایاں ہونے لگتا ہے۔ یعنی گوریلا، شمپازی، گیبون وغیرہ اقسام کا۔ اب اس کے بعد آخری مرتبہ تطور آتا ہے، اور اچانک ایک انقلابی حالت طاری ہونے لگتی ہے۔ یعنی تمام حیوانی و میمونی خصوصیات مفقود ہو جاتی ہیں۔ ایک نئی نوعیت کا ہیکل نمایاں ہو جاتا ہے اور وجود انسان اپنی ساری خصوصیتوں اور رعنائیوں کے ساتھ اُبھر آتا ہے۔

ابتداء کے تمام تطورات ایک مہینے کے اندر طاری ہوتے ہیں۔ آخری تطورات دوسرے مہینے کے اندر اور پھر حمل کا بقیہ زمانہ جس قدر گزرتا ہے، صورت انسانی ہی کی تکمیل پر گزرتا ہے۔

قانون حیات کی عالمگیر وحدت:۔

اس سلسلہ میں جو حقیقت سب سے زیادہ اہم نمایاں ہوئی ہے اور جس نے علم و نظر کے بہت سے گوشوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ وہ پیدائش حیات کے قانون کی عالمگیر وحدت ہے۔ نباتات سے لے کر وجود انسانی تک اصل و بنیاد حیات ایک ہی ہے اور جس قدر امتیازی اختلافات پیدا ہوتے ہیں، ٹھیک ٹھیک اپنی حدود کے اندر اور انہی ترتیبات سے جو قانون نشو و ارتقاء کی بنا پر ضروری ہیں۔ اس اعتبار سے اگر انسان کے جنین پر نظر ڈالی جائے تو حسب ذیل مدارج اور ان کے احکام سامنے آئیں گے۔

مدارج تطور:۔

(الف) پہلا درجہ وہ ہے جس میں خلیہ تخم کی حالت ٹھیک ٹھیک ویسی ہی ہوتی ہے جیسی تمام نباتات اور حیوانات کی۔ گویا اس ابتدائی درجہ میں ایک انسان کا جنین بھی ویسا ہی ہوتا ہے، جیسا ایک درخت کا، ایک مچھلی کا، ایک چار پائے کا، ایک پرندہ کا۔

یہ حالت نطفہ کی ابتدائی حالت ہوتی ہے۔

---

[1] Amphibia کا لفظی ترجمہ ذات الحیاتین ہے یعنی ایسے جانور جو تری اور خشکی دونوں طرح کے گرد و پیش میں رہتے ہیں۔ ہم نے اس کیلئے قوازب کا لفظ اختیار کیا جو میجر جنرل ایلن معلوف صاحب معجم الحیوانات کے اقتباسات میں ہے۔

Marfat.com

(ب) پھر خُلیات کا کُردی مجموعہ ایک دوسرے درجہ میں داخل ہوتا ہے۔ اس درجہ میں پہلا امتیاز نمایاں ہوتا ہے۔ یعنی اب جنین نباتات کے دائرہ سے بلند ہو کر صرف حیوانات کے دائرہ کی چیز بن جاتا ہے۔ ہم تمام حیوانات کا جنین ایسا ہی پاتے ہیں۔ مگر نباتات کا نہیں۔

یہ حالت دو ہفتہ کے اندر طاری ہو جاتی ہے۔

(ج) تیسرے ہفتہ میں جنین دوگنی طوالت پیدا کر دیتا ہے اور نعل کی سی شکل بن جاتی ہے۔ نیز ایک نشان ظاہر ہو جاتا ہے پھر آگے چل کر (Head) بننے والا ہوتا ہے۔ یہی نشان تین بنیادی حالتوں کی پہلی داغ بیل ہے۔

اس درجہ میں دوسرا امتیاز نمایاں ہوتا ہے۔ یعنی اب جنین حیوانات کے عام دائرہ سے نکل کر حیوانات لبونہ کے خاص دائرہ میں آ جاتا ہے۔ لیکن ادنیٰ درجہ کے دائرہ میں

(د) چوتھے ہفتہ میں سر کا نشان ایک غیر مشکل گنبد کی سی ہیئت پیدا کرنے لگتا ہے۔ اس کے اندر بھیجے کے چاروں خانے بھی نمایاں ہو جاتے ہیں، عنصری، نالیاں بھی ابھر آتی ہیں۔ دل کے چاروں حصے بھی وجود پذیر ہو جاتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ ریڑھ کی ہڈی کا ڈھانچہ پوری طرح نشو و نما پانے لگتا ہے۔

اس درجہ میں پہنچ کر جنین اعلیٰ درجہ کے حیوانات لبونہ کی خصوصیات پیدا کر لیتا ہے۔ یعنی اب انسان کا جنین ایسا ہو جاتا ہے جیسا گھوڑے، بیل، کتے وغیرہ شیر خوار جانوروں کا ہوتا ہے۔

اب حمل کا پہلا مہینہ ختم ہو گیا۔

(ہ) پانچویں ہفتہ سے صورت آرائی کا زیادہ مشخص دور شروع ہوتا ہے۔ لیکن یہ بندر کے سے ہیکل کا ہوتا ہے۔ اس درجہ کے جنین کی تصویر بندر کے جنین کی تصویر کے ساتھ رکھی جائے تو دونوں میں کوئی نمایاں فرق دکھائی نہیں دے گا۔

Marfat.com

(و) پھر ہیکل بندر کی اونچی قسم کے ہیکلوں کی طرف بڑھتا ہے، اور گوریلا شمپازی وغیرہ کے جنین کی سی ہیئت پیدا کرنے لگتا ہے۔

(ر) اس کے بعد ایک آخری انقلاب طاری ہوتا ہے، اور انسانی جسم وصورت کی خصوصیات یکا یک ابھرنے لگتی ہیں حتی کہ بالکل ایک نئی قسم کا تناسب واعتدال ظہور میں آجاتا ہے۔

دوسرے مہینے کے اختتام پر یہ درجہ پوری طرح صورت پذیر ہوجاتا ہے۔

(ح) اس کے بعد فطرت کی نقاشی زیادہ دقیق قسم کے امتیازات کا نوک پلک درست کرنے لگتی ہے۔ یعنے نوع انسان کے مختلف وطنی، موسمی، نسلی اور معنوی اختلافات ابھرنے اور بننے لگتے ہیں۔ پھر جدی اور آبائی اثرات کی نمود شرع ہوتی ہے اور ہر والدین کو اپنی قوم، اپنے ملک، اپنی نسل اور اپنے ماحولی موثرات کا مولود میسر آجاتا ہے۔

یہ آخری انسانی دور سب سے بڑا دور ہے۔ یعنی ابتدا کے دو مہینے چھوڑ کر باقی تمام ایام حمل جن کی مدت چار سے سات مہینوں تک پہنچ جاتی ہے، اسی دور میں بسر ہوتے ہیں۔

قرآن کی تصریحات:-

اب ان تمام تفصیلات کو پیش نظر رکھ کر قرآن کی تصریحات پر غور کرو اور پچھلی تفاسیر پر بھی ایک نظر ڈال لو۔ جس وقت تک انسانی جنین کے یہ تمام حقائق منکشف نہیں ہوئے تھے، قرآن کے بیان کردہ مدارج ستہ کی تشریح کس درجہ دشوار تھی؟ قدیم نظریوں کے ساتھ دینے کے لئے مفسروں کو کیسی کیسی توجیہیں ڈھونڈنی پڑیں اور پھر بھی بات بنی نہیں؟ لیکن اب انکشافات کے بعد کس طرح سارا معاملہ صاف ہوگیا ہے؟ کس طرح دونوں بیان ٹھیک ٹھیک ایک دوسرے کے مطابق ہیں اور ایک کے اجمال کی دوسرا تفصیل کررہا ہے؟ کس طرح آج علم کی آنکھیں بھی وہی دیکھ رہی ہیں جو وحی کی زبان نے آشکارا کردیا تھا؟

Marfat.com

وحی کی یہ صدا کس کی زبان سے نکلی تھی؟ ساتویں صدی عیسوی کے ایک اُمّی کی زبان سے جو ریگستان عرب کے بادیہ نشینوں میں پیدا ہوا اور جس کی ساری زندگی انہی بادیہ نشینوں میں بسر ہوئی تھی!

قرآن کا سترھویں صدی کے نظریہ سے انکار:-

سترھویں صدی میں خوردبینی مطالعہ سے جراثیم حیات کا انکشاف ہوا، لیکن حکماء عہد اصل حقیقت پر مطلع نہ ہو سکے۔ اور "مذہب ظہور و بروز" کا نظریہ قائم کر لیا گیا۔ اب دیکھو جس طرح قدیم قیاسات قران کا ساتھ نہیں دیتے تھے، اسی طرح یہ مذہب بھی ساتھ چلنے سے صاف انکار کر رہا تھا۔ قرآن جنین کے تمام تغیرات کو صاف صاف ایک انقلابی تطور قرار دے رہا ہے۔ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ (۵:۲۲) اور ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً (۱۴:۲۳) یعنی تخلیق کی ایک حالت نطفہ کی ہوتی ہے۔ پس یہ محض کسی ایسے کیڑے کا نشو و بروز نہیں ہو سکتا جس کے اندر موجود انسان اپنے تمام اصول و جزئیات کے ساتھ موجود ہو، بلکہ ایک حالت کے بعد صریح دوسری حالت کی پیدائش اور دوسرے کے بعد تیسرے کے بعد چوتھے کی پیدائش ہے اور ہر پیدائش تخلق و تطور کی نوعیت میں ظاہر ہوتی ہے۔ ضروری ہے کہ یکے بعد دیگرے طرح طرح کے تطورات طاری ہوں۔ ضروری ہے کہ ہر تطور ایک نئی پیدائش کا حکم رکھتا ہو۔

جدید مفسرین کی بے نتیجہ قطع و بُرید:-

چونکہ انیسویں صدی کے اواخر تک ہی نظریہ "ظہور زو بروز" عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا اور فن طب و تشریح نے بھی اسی کو اختیار کر لیا تھا، اس لئے جس طرح قدیم مفسروں کو شرح و تحقیق آیت میں دشواریاں پیش آئیں اور طرح طرح کی توجیہات کرنی پڑیں، اسی طرح مصر اور ہندوستان کے بعض نئے مفسروں کو بھی ٹھوکر لگی اور رفاء بک طہطاوی، حسن پاشا محمود، سرسید احمد خاں، شیخ محمد عبدہ، وغیرہم اسی نظریہ کی

Marfat.com

وادیوں میں گم ہوگئے۔ انہوں نے کوشش کی کہ قرآن کی تصریحات کو اس کے مطابق کردکھائیں۔ مطابق ہو نہیں سکتی تھیں۔ اس لئے ہر طرح کا تجوز و تکلف جو لغت زبان سے کیا جاسکتا ہے، جائز کرلیا گیا۔ اور نہیں سمجھے کہ یہ تمام قطع و برید چند سالوں کے بعد یکسر بیکار ہو جائے گی۔

قرآن اپنی جگہ سے نہیں ہلا مگر علم کو ہلنا پڑا:۔

لیکن قرآن کی تصریحات اپنی جگہ بدستور قائم رہیں جس طرح قدیم جامہ ان پر راست نہیں آیا تھا، اسی طرح نئے جامے سے بھی انہوں نے انکار کردیا، یہاں تک کہ جمال حقیقت بے پردہ ہوا اور نظریوں کی شب کوری کی جگہ انکشاف و مشاہدہ کی صبح نمودار ہوگئی۔ اب ہر نگاہ دیکھ سکتی ہے کہ قرآن کو اپنی جگہ سے ہلنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ علم کا نقص تھا کہ صحیح جگہ نہ پاسکا۔ آخر اسے اپنی جگہ چھوڑنی پڑی'' اور وہیں آ گیا جہاں تیرہ صدیوں سے قرآن کی صداقت جمی کھڑی ہے: ''لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ م بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٌ.''

''تم علم کی ایک ذراسی نمود دیکھ کر مرعوب ہو جاتے ہو اور چاہتے ہو۔ قرآن کو فوراً اس کی جگہ سے ہٹا دو۔ لیکن اگر تم جلدی نہ کرو تو قرآن کو ہلنے کی ضرورت کبھی نہ ہوگی۔ جلد یا بہ دیر علم اپنی جگہ چھوڑ دے گا اور آگے بڑھ کر قرآن کی تصدیق کرے گا۔''

اب غور کرو علم کی روشنی میں کس طرح قرآن کی تمام تصریحات واضح ہو رہی ہیں۔ بغیر اس کے کہ لغت و زبان کے قدرتی مقتضیات سے رائی برابر بھی انحراف کیا جائے۔

قرآن کے مدارج ستہ:۔

(۱) سب سے پہلے جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ پر غور کرو۔ استقرار حمل یوں ہوتا ہے کہ جنس رجال کا جنین خلیہ جنس اناث کے بیض میں پہنچتا ہے، اور اس طرح ٹک جاتا ہے گویا اپنے اصلی مکان میں پہنچ گیا۔ اس صورت حال کے لئے فی قرار مکین کی ترکیب کس درجہ صحیح اور موافق ہے؟ دو لفظوں کے اندر پوری وضاحت کے ساتھ

Marfat.com

دونوں حالتیں آ گئیں، اس کا ٹھہر جانا اور تمکن کے ساتھ قرار پا جانا۔ استقراء و تمکّن کس طرح پیدا ہوا؟ دونوں جنسوں کے خلیوں کے اتحاد سے۔ اس اتحاد وامتزاج کی ان میں قدرتی طلب تھی۔ بغیر اس کے قرار نہیں پا سکتے تھے۔

اس وقت تک ہم نے اس کا مطلب یہ سمجھا تھا کہ نطفہ رحم میں قرار پا جاتا ہے، لیکن فی الحقیقت بات پوری طرح جمی نہ تھی۔ رحم تو ایک طرح کا مجوّف خول ہے۔ اس میں ایک ذرہ تخم کا پڑ جانا فی قرار مکین سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تعبیر کہہ رہی ہے کہ کوئی نطفہ ہی کی طرح کا دقیق محل ہونا چاہیے جہاں وہ پہنچ کر اس طرح ٹک جائے جیسے ٹھیک اپنے حجم اور اپنی نوعیت کے مطابق ایک جگہ اسے مل گئی۔ پس یقیناً اس سے مقصود بیض کا خلیہ ہے نہ کہ پورا عضو رحم۔

(۲) اس کے بعد "نُطْفَہ" پر مختلف حالتیں طاری ہوتی ہیں، لیکن سب سے پہلے انقلابی حالت کون سی ہوتی ہے جو بالکل ایک نئی قسم کی نوعیت پیدا کر دیتی ہے؟ اور جو تمام آئندہ انقلابوں کیلئے سنگ بنیاد کا کام دیتی ہے؟ وہ حالت جب خلیات کا کروی مجموعہ اچانک طول میں بڑھنے لگتا ہے۔ اور پھر اس طرح کی لمبی چیز بن جاتا ہے جس کے دونوں سرے کسی قدر پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ پروفیسر ہیکل نے اس مرتبہ کی ابتدائی حالت کو Sole Shaped اور پختہ حالت کو Sandal Shaped سے تعبیر کیا ہے۔ [۱] اور ہم نے اس کے لئے صرف "نعل نما" حالت کی تعبیر اختیار کی ہے اسی مرتبہ تحول کو قرآن نے "عَلَقَہ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، "عَلَقَہ" کی تعبیر اس مرتبہ کے لئے ہر اعتبار سے اتنی صاف اور چسپاں تعبیر ہے کہ جونہی میری پہلی نظر اس نعل نما جنین کی تصویر پر پڑی تھی میری زبان سے بے اختیار "خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ" نکل گیا تھا۔

---

[۱] دیکھو پروفیسر موصوف کی کتاب دی ایوولیوشن آف مین کا انگریزی ترجمہ، جوزف مکب جلد اول صفحہ ۲۵۲ و مطبوعہ ۱۹۱۰ء

Marfat.com

جونک کیلئے علوق، علوقہ، سولی، "عَلَقَہ" سامی زبانوں کی نہایت قدیم تعبیر ہے۔ عبرانی میں اسے علوقہ کہتے تھے اور بعینہ علقہ کا نام بھی ملتا ہے۔ چنانچہ سفرا مثال میں، ایک جگہ آیا ہے "جونک کی دو بیٹیاں ہیں جو چلاتی رہتی ہیں کہ لاؤ۔ لاؤ (۳۰:۱۵) طبرانی نسخہ میں یہاں "جونک" کیلئے علوقہ کا لفظ ہے۔ یہی علوقہ عربی میں علق اور علقہ ہے اور جونک کیلئے مشتمل ہے۔ اب جونک کی حالت اور صورت کا معائنہ کرو۔ اس میں ہڈی نہیں ہوتی محض ایک لوتھڑے کی نسبان ہوتی ہے، اور خون پی کر جب سیراب ہو جاتی ہے تو ٹھیک ویسی ہی صورت ہو جاتی ہے جیسی اس مرتبہ جنین کی تصویریں نظر آتی ہے۔

علقہ کی تعبیر:-

ہیکل نے اس حالت کو محض اس کی جزئی مشابہت کی بنا پر "نعل نا صورت" سے تشبیہ دی لیکن قرآن نے "علقہ" سے دی جو خود سلسلہ حیوانات کی ایک خاص زندہ کڑی ہے، اور اس طرح عجب نہیں کہ ایک دوسری مخفی حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہو۔

پیدائش انسانی کے مختلف مدارج کی جو تفصیلات اوپر گزر چکی ہیں۔ ان سے آپ کو پتہ لگ گیا ہوگا کہ قانون نشوو ارتقا کے مختلف مدارج کس طرح نطفہ انسانی کے مدارج میں جمع ہو گئے ہیں، اور کس طرح ہر انسان کا جنین اب بھی ان مدارج سے گزر کر انسان بنتا ہے، جن مدارج سے گزر کر انسان اپنے موجودہ مرتبہ خلقت تک پہنچا ہے۔ اچھا اب غور کرو، ان مدارج خلقت میں ابتدائی مخلوقات کا درجہ کونسا ہے؟ آبی مخلوقات کا یعنی بحکم وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ زندگی کا سب پہلا ظہور پانی میں ہوا اور پہلی مخلوقات آبی مخلوقات ہوئی۔ ان کے بعد خشکی کی مخلوقات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اچھا، آبی مخلوقات میں ابتدائی مراتب کی مخلوقات کونسی ہیں؟ جونک کی قسم کی غیر عظمی مخلوقات انہی کے ارتقاء سے تمام اونچی قسم کی آبی کڑیاں وجود پذیر ہوئیں۔

Marfat.com

پس اگر حیوانی نطفہ اپنے تمام ارتقائی تطورات سے گزر کر آخری درجہ تک پہنچا کرتا ہے۔تو کیا ضروری نہیں کہ اس کا ابتدائی درجہ آبی مخلوقات کی حالت کے درجہ کا ہو؟ اور اس میں بھی سب سے پہلے جونک کی قسم کی نوعیت اپنی نمود دکھائے؟ یقیناً ضروری ہے اور یقیناً یہی نوعیت ہے جو اس نعل نا صورت کے درجہ میں نمایاں ہوتی ہے۔پس اسے "علقہ" سے تعبیر کرنا، گویا اس کے درجہ خلقت کو ٹھیک ٹھیک اس کے اصلی نام سے پکار دینا ہے۔

(۳) اس کے بعد تیسرا انقلابی تطور وہ ہے جب یہ نعل نما چیز اور زیادہ بڑھتی ہے اور اس کے مادہ میں گوشت کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔اسی حالت کو قرآن نے "مضغہ" سے تعبیر کیا ہے۔کیونکہ اب جنین بوٹی کی طرح بن جاتا ہے اور چونکہ یہی مرتبہ ہے جس میں ارتسام وانقسام اعضاء کی پہلی داغ بیل پڑتی ہے۔اس لئے سورہ حج میں ارشاد کر دیا کہ "مُخلَّقَةٍ وَّغیرِ مُخلَّقَةٍ" (۵:۲۲) یعنی یہی مُضغہ کا درجہ ہے جس میں یا تو داغ بیل پڑ جاتی ہے یا بگڑ کے رہ جاتا ہے۔

(۴) چوتھا درجہ وہ ہے جب اس مُضغہ میں ریڑھ کی ہڈی کا ڈھانچہ نشوونما پانے لگتا ہے اور ایک ایسا ہیکل نمایاں ہو جاتا ہے جسے مچھلی سے مشابہہ کہا گیا ہے۔ اسی کو فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَاماً سے تعبیر کیا ہے۔اسی درجہ میں آ کر جنین حیوانات فقاریہ Vertebrate (ریڑھ کی ہڈی والے جانور) کی امتیازی خصوصیات پیدا کر لیتا ہے۔

(۵) پھر اس کے بعد ہڈیوں اور گوشت پوست کا الحاق تکمیل تک پہنچتا ہے اور ایک حیوانی صورت تمشکل نمایاں ہو جاتی ہے۔اسی کو فَکَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْماً کے درجہ سے تعبیر کیا ہے۔

خَلْقًا اٰخر:-

(۶) لیکن جو صورت اب بنتی ہے، وہ کیا انسان کی صورت ہوتی ہے؟ نہیں ایسی

Marfat.com

جو تمام حیوانات لبونہ کی مشترکہ صورت ہوتی ہے، وہ ترقی بھی کرتی ہے تو بندر کی صورت کی طرف۔لیکن اس کے بعد نقاش قدرت کی دستکاری اچانک ایک نیا انقلاب وتحویل پیدا کر دیتی ہے۔وہی جنین جو محض مُضغَہ تھا۔وہی مُضغَہ جو مچھلی کی طرح کا ایک ڈھانچہ تھا۔وہی ڈھانچا جس نے عام حیوانی ہیکل کی شکل اختیار کرلی تھی۔وہی حیوانی ہیکل جو بندر کی سی صورت میں ابھر آیا تھا، اچانک انسانی جسم وصورت کی ساری خصوصیتیں اور رعنائیاں پیدا کرلیتا ہے۔ فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحسَنُ الْخَالِقِینَ یہی آخری مرتبہ تحول ہے جسے ثُمَّ اَنْشَأْنٰہُ خَلْقًا اٰخر سے تعبیر کیا ہے (ترجمان القرآن جلد دوم از ابوالکلام آزاد)

موافقین ''ومخالفین'' ارتقاء:۔

پیشتر اس کے ہم مسئلہ ارتقاء کے موافقین ''ومخالفین'' کا ذکر کریں، ہم آپ کی توجہ ایک بار پھر انسائیکلوپیڈیا کے فاضل مقالہ نگار کے ''مسئلہ ارتقاء'' سے متعلق مقالہ کی طرف دلاتے ہیں جس کا خلاصہ شروع میں پیش کیا گیا ہے۔فاضل مقالہ نگار نے اس مسئلہ کو تین شقوں میں تقسیم کیا ہے (۱) حقیقت ارتقاء (۲) عوامل ارتقاء (۳) نتیجہ ارتقاء۔اس میں اس نکتہ کی وضاحت کی گئی ہے کہ اول شق یعنی حقیقت ارتقاء پر سب متفق ہیں۔اختلاف صرف شق دوم یعنی عوامل ارتقاء کے بارے میں ہے۔آپ اس مقام کو پھر ایک بار پڑھ کر اور ذہن میں رکھ کر آگے بڑھیں۔اس سلسلے میں ہم محترم سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نام پیش کرتے ہیں جن کو مسئلہ ارتقاء کا مخالف سمجھا جاتا ہے اور وہ خود اپنی تحریرات میں بھی اس قسم کا تاثر دیتے ہیں کہ وہ اس مسئلہ کے ''مخالفین'' میں ہیں۔محترم سید صاحب کا مسلمان قوم کے اندر ایک خاص مقام ہے۔محترم سید صاحب قرآن حکیم کی ان آیات کی جو معاشرت، سیاست، قانون یا آئین سے متعلق ہوں نہایت عمدہ تشریح کرتے ہیں جن کی بنیاد علمی دلائل پر ہوتی ہے۔ان کا سب سے

Marfat.com

بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے متحدہ ہندوستان کے وقت اسلام کو بحیثیت ایک نظام حیات کے پیش کیا۔ اگرچہ اس بات میں پیش رو (Poineer) ابوالکلام آزاد تھے لیکن انہوں نے اسلام کے نظام حیات کے گلستان کی سڑکوں اور روشوں کی سیر کرائی۔ محترم سید صاحب نے اس بات کو کیاری کیاری، درخت درخت، بوٹا بوٹا اور گملہ گملہ دکھا دیا۔ اس سلسلے میں مخالفین تک ان کے خوشہ چین ہیں۔

مسئلہ ارتقاء کے متعلق ان کی تحریرات ہمارے پیش نظر ہیں۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ محترم سید صاحب مسئلہ ارتقاء کی شق اول یعنی حقیقت ارتقاء کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن شق اول شق دوم کے ساتھ غلط طور پر خلط ملط کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں یا کم از کم پڑھنے والا اس سے یہ تاثر لیتا ہے کہ وہ ارتقاء کے مخالف ہیں۔ اب میں ان کی تحریرات کو پیش کرتا ہوں۔ "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی[1] میں عالم آخرت جس کا تصور قرآن کا بنیادی حقیقتوں میں سے ہے کا ثبوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"انسان جو کائنات ارضی کا گل سرسبد ہے جس کی ذی شعور ہستی اس کائنات کے تدریجی ارتقاء اور اس کی تمام حرکات و تحولات[2] کا ماحصل ہے۔۔۔۔۔"

اس کے بعد چند مقدمات پیش کرتے ہیں جن سے عالم آخرت کے یقینی وقوع کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں:-

"عالم وجود کے تمام آثار اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ اس نظام کے جتنے تغیرات اور

---

[1] یہ کتاب سید صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ترجمان القرآن میں شائع ہوتے رہے۔ اس کو کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ پہلے یہ ۱۹۵۵ء میں طبع ہوئی۔ دوبارہ ۱۹۶۰ء میں طبع ہوئی۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

[2] تحول ارتقاء کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انواع میں بعض اوقات اس طرح تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں کہ ایک نوع، علت و معلول کی کئی کڑیاں پھاند کر، دوسری نوع میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسے تحول فجائی (Mutation) کہتے ہیں۔ یہ تبدیلی چونکہ اچانک عمل میں آتی ہے۔ اسلئے یہ فجائی کہلاتی ہے۔ یہ نظریہ فجائی ارتقاء (Emercent Evolution) کا نظریہ کہلاتا ہے۔ پروفیسر لائڈ مارگن نے اس موضع پر کتاب لکھی ہے۔

Marfat.com

تحولات ہیں ان سب کا رخ ارتقاء کی جانب ہے۔اس کی ساری گردشوں کا مقصد یہ ہے کہ یہ نقص کو کمال کی طرف لے جائیں اور اشیا کی ناقص صورتوں کو مٹا کر، انہیں کامل اور کامل سے کامل تر صورت بخشیں۔اس قانون ارتقاء کا عمل چونکہ تغیر کی روش پر ہوتا ہے اسلیئے ہر کون کیلیئے ایک فساد ضروری ہے۔ ہر صورت کا وجود میں آنا اس کا مقتضی ہے کہ پہلی صورت فاسد ہو جائے اور ناقص صورت کا زائل ہونا کامل تر کے وجود میں آنے کا دیباچہ ہوا کرتا ہے۔ یہ تغیرات و استحالات اگرچہ ہر آن ہوتے رہتے ہیں۔لیکن بہت سے خفی تغیرات [3] کے بعد ایک جعلی [4] اور نمایاں تغیر واقع ہوا کرتا ہے۔

ہر صورت اپنے لئے ایک خاص محل چاہتی ہے، جو اس کے مناسب حال ہوا کرتا ہے۔کوئی صورت کسی ایسے محل میں نہیں رہ سکتی جو اس کے مناسب حال نہ ہو۔ مثلاً صورت نباتی کے لئے حیوانی جسم غیر مناسب ہے، اور صورت انسانی اسی جسم اور اسی مخصوص طور کے نظام جسمانی کی طالب ہے جو انسان کیلیئے بنایا گیا ہے۔ پس اگر کسی شے کو ایک ترقی یافتہ صورت دینی ہو تو لازم ہے کہ فروتر درجہ کی صورت کیلیئے جو محل بنایا گیا ہے اسے توڑ دیا جائے اور نئی صورت کے لئے مناسب حال محل تیار کیا جائے۔

اجزائے عالم کے حق میں قانون ارتقاء کی ہمہ گیری کو جس شخص نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے، اس کے نزدیک یہ بات ہرگز مسئلہ نہیں کہ یہی قانون اس پورے نظام عالم پر بھی حاوی ہو۔اس وقت جو نظام عالم ہم دیکھ رہے ہیں اس کے متعلق ہم نہیں کہہ سکتے کہ جب سے خلق و ابداع کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔اس وقت سے یہی مخصوص نظام اپنے اپنی قوانین کے ساتھ چل رہا ہے۔اس سے پہلے نامعلوم کتنے نظامات گزر چکے ہوں گے جن میں ہر ایک نے اپنی اپنی عمر پوری کر کے دوسرے ترقی یافتہ نظام کیلیئے جگہ خالی کر دی اور ارتقاء کے تدریجی مراتب سے گزر کر سلسلہ وجود ہمارے اس نظام تک پہنچا۔" [1]

---

[3] جسے ڈارون (Variations) کا نام دیتا ہے۔

[4] جسے ارتقاء والے تحول فجائی (Mutation) کہتے ہیں۔

[1] ان عبارتوں کو پڑھیئے کہ محترم سید صاحب کس طرح ارتقاء کو بحیثیت ایک تسلیم شدہ حقیقت کے بیان کر رہے ہیں ورنہ عالم آخرت کے یعنی وقوع کے ثبوت کا کچھ مطلب نہیں۔لیکن پھر یہ تاثر دیتے کے لئے کہ اس نظریہ کے خلاف ہیں تفہیم، القرآن جلد دوم ص ۱۲ کے تحت المتن لکھتے ہیں"۔ سائنس سے محض سرسری واقفیت رکھنے والے لوگ تو بے شک اس غلط فہمی میں ہیں کہ یہ نظریہ ایک ثابت شدہ بھی حقیقت ہے۔"

Marfat.com

اس عبارت کے سلسلے میں ایک صاحب نے وضاحت چاہی کہ جو ارتقاء کا تصور آپ پیش کر رہے ہیں اور ڈارون نے دیا ہے اس میں کیا فرق ہے؟ اس کے جواب میں محترم سید صاحب نے جو جواب دیا وہ ہمارے اُس خیال کی تصدیق کرتا ہے جس کا ذکر ہم نے شروع میں کیا ہے کہ محترم سید صاحب حقیقت ارتقاء کو تسلیم کرتے ہیں۔

جواب ملاحظہ ہو:-

"جس ارتقاء کا میں نے ذکر کیا ہے وہ ہیگل اور ڈارون دونوں کے نقطہ نظر سے مختلف ہے۔ ہیگل کے تصورات اور خیالات کی نزاع کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس نزاع کی بدولت تصورات کا ارتقاء ہوتا ہے ڈارون حیات کے ارتقاء کا ذکر کرتا ہے اور اس کے نزدیک یہ ارتقاء تنازع للبقاء (Struggal For Existence) انتخاب طبعی (Natural Selecting) اور بقائے اصلح (Survival for the Fittest) کے اصول سرگانہ کے ماتحت واقع ہوتا ہے۔ اس کے خلاف میں نے آپ کی دریافت کردہ عبارت میں جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ قدرت الٰہی کمتر درجہ کی چیزوں سے تخلیق کی ابتدا کر کے بتدریج بلند تر درجہ کی چیزیں پیدا کر رہی ہے۔ مثلاً جمادات پہلے پیدا کیے گئے، اس کے بعد نباتات، پھر حیوانات اور حیوانات میں بھی کم تر درجہ کے حیوانات پہلے پیدا کیے گئے اور پھر بتدریج اعلیٰ قسم کے حیوانات پیدا کیے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بلند ترین نوع یعنی انسان کو پیدا کیا گیا۔

(ترجمان القرآن محرم وصفر ۶۸ھ بمطابق جنوری، فروری ۱۹۴۵ء بحوالہ رسائل و مسائل حصہ اول)

یہاں یہ امر دریافت طلب ہے کہ محترم سید صاحب کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ قدرت الٰہی کمتر درجہ کی چیزوں سے تخلیق کی ابتدا کر کے بتدریج بلند درجہ کی چیزیں پیدا کرتی رہی ہے۔ مثلاً جمادات پہلے پیدا کیے گئے اور اس کے بعد نباتات پھر حیوانات۔ سید صاحب نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ بھی بتلا دیا کہ اور حیوانات میں بھی کم درجہ کے حیوانات پہلے پیدا کیے گئے اور پھر بتدریج اعلیٰ قسم کے حیوانات پیدا کیے جاتے رہے۔ اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سب سے بلند ترین نوع، انسان کی نوع ہے

Marfat.com

جیسے جمادات پھر نباتات پھر حیوانات کے بعد پیدا کیا گیا۔ کیا مسئلہ ارتقاء کو کلیتہً نظر انداز کرتے ہوئے اپنے خیال کے مطابق وہ کوئی اپنا دوسرا ذریعہ معلومات بتلا سکتے ہیں جس سے ان کو علم ہوا ہو کہ تخلیق اس ترتیب کے ساتھ ہوئی جو انہوں نے بیان کی ہے۔

دوسری بات جو وضاحت طلب ہے یہ ہے کہ "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی" کے جس اقتباس کو بنیاد بنا کر سائل نے سوال پوچھا۔ کیا جواب، اس سوال کا جواب کہا جا سکتا ہے؟ اس اقتباس میں جو اصطلاحات اور جملے استعمال کئے ہیں اور جس طریقہ پر انہیں پیش کیا ہے یعنی انسان کو کائنات کے تدریجی ارتقاء اور اس کی تمام حرکات اور تحولات کا ماحصل قرار دینا، خفی تغیرات (Variation) اور جلی تغیرات (Mutation) کا ذکر اور فرق بیان کرنا، ایک نظام کا دوسرے نظام کیلئے جگہ خالی کرنا۔ اجزائے عالم کے حق میں قانون ارتقاء کی ہمہ گیری کو تسلیم کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ ارتقاء کے تدریجی مراتب سے گزر کر سلسلہ وجود ہمارے پاس نظام تک پہنچا۔ ان سب بیانات سے ارتقاء کی جو شکل بنتی ہے کیا وہ یہی ہے جو سائل کے جواب میں محترم سید صاحب نے پیش کی ہے؟ ہم خود ڈارون کے لادینی نظریات کے قائل نہیں اور نہ کوئی مسلمان ہو سکتا ہے لیکن کیا محترم سید صاحب کی شان کے یہ شایان ہے کہ خود ارتقاء کا یہ تصور رکھتے ہوئے دوسروں پر ڈارون سے متاثر مفسر[1] کی پھبتیاں کسیں اور ان پر طنز کریں۔ صرف اسلئے کہ مذہبی طبقے میں بھی ان کی مقبولیت کا کوئی ذریعہ باقی رہ جائے یا جماعت اسلامی کے جو افراد مسئلہ ارتقاء کے خلاف ہیں وہ بھی ان کو اپنا ہم نوا سمجھیں۔

---

[1] محترم سید صاحب نے مسئلہ ارتقاء کے موافقین پر اپنی تحریروں میں پھبتیاں کسی ہیں اور ایسے افراد کو "ڈارونیت کے متاثر مفسرین" قرار دیا ہے قارئین کرام ان اقتباسات کو پیش نظر رکھ کر خصوصاً وہ الفاظ ہو عبارتیں جو کہ جلی قلم سے لکھی ہوئی ہیں، فیصلہ کر سکتے ہیں کہ خود محترم سید صاحب بھی کس حد تک ڈارونیت سے متاثر ہیں۔ انہوں نے اصطلاحات بھی ڈارون اور دیگر علماء ارتقاء سے مستعار لی ہیں۔ جنکی وضاحت میں کر دی گئی ہے۔

Marfat.com

باقی رہا ڈارون کے اصول سرگانہ سے انکار تو یہ مسئلہ ارتقاء کی دوم شق کا انکار ہے اور یہ انکار تو خود علمائے ارتقاء بھی کرتے چلے آئے ہیں جس کا آگے ذکر آرہا ہے۔[1] جہاں تک اول شق یعنی حقیقت ارتقاء کا تعلق ہے اسے تسلیم کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا ایک اقتباس ان کے اس تصور کی پوری وضاحت کرتا ہے جو انہوں نے اپنے ایک مضمون بعنوان "ڈارون کا نظریۂ ارتقاء" میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

ڈارون نے جب تحقق و تجسس کا آغاز کیا۔ اُس وقت اگر وہ قرآن کے دیئے ہوئے نقطہ آغاز (Starting Point) سے چلتا تو اِس نتیجے پر پہنچتا کہ زندگی کی شکلوں میں یہ تنوع اور تفاضل جو ایک بے نظیر ترتیب کے ساتھ واحد الخلیہ بھنگے (Unicellular Animal) سے لے کر انسان تک میں نظر آرہا ہے، یہ ایک حکیم کے منصوبے کا نتیجہ ہے جو مختلف انواع کی زندگی کے لئے مناسب ماحول اور سازگار حالات فراہم کرنے کے بعد انہیں ان کی مخصوص نوعی خصوصیات کے ساتھ بتدریج وجود میں آتا چلا گیا ہے اور جن انواع کی ضرورت اس کے خاکے میں باقی نہیں رہی، انہیں مٹاتا بھی آرہا ہے۔[1]

---

[1] ڈارون کے نزدیک ارتقاء کے عوامل تنازع للبقاء (Struggle for existence) انتخاب طبیعی (Natural Selection) اور بقائے اصلح (Survival of the fittest) ہیں۔ طبیعی کو محض ایک خارجی علت قرار دیتا ہے، اس پر تنقید آگے آرہی ہے۔ تنازع للبقاء اور بقائے اصلح کے اصولوں کا جہاں تک تعلق ہے حیوانی سطح پر ان کا اطلاق ہوتا ہے۔ ڈارون نے ان اصولوں کو معلوم (Discover) کیا اور ایک نام سے ان کو موسوم کیا۔ اگر وہ ان کو یہ نام نہ دیتا جب بھی یہ ایک حقیقت تھی۔ اگر ہمیں کسی طبیعی یا حیاتی قانون کا علم نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کائنات میں نافذ ہی نہیں۔ ڈارون نے جو غلطی کی وہ یہ ہے کہ ان کا اطلاق انسانی زندگی پر بھی کیا۔ حالانکہ انسانی سطح پر پہنچ کر ارتقاء کا عمل تبدیل ہو جانا چاہیئے تھا اور ہو بھی گیا۔ لیکن اس تمام بحث کا یہ مقام نہیں۔ یہ بحث عوامل ارتقاء کا جائزہ لیتے وقت کی جائے گی۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ ان سرگانہ اصولوں کے اندر اس وقت کا ایک پہلو ضرور موجود ہے۔ عارف رومی کہتے ہیں:-

ایں جہاں جنگ است کل چوں بنگری — ذرہ با ذرہ چوں دیں با کافری
جنگ فعلی ہست از جنگ نہاں — زیں تخالف آں تخالف را بداں
جنگ فعلی، جنگ طبعی، جنگ قول — درمیان جزوہا حربیست ہول
ایں جہاں زیں جنگ قائم مے بود — درعناصر در نگر تا حل شود
پس بنائے خلق بر اضداد بود — لاجرم جنگی شدند از ضرّ و سُود
ہست احوالت خلاف یک دگر — ہر یکے با ہم مخالف در اثر
گوہر جاں چوں ورائے فصلہاست — خوئے اُو ایں نیست خوئے کبریاست
ایں تنافی از ضد آید ضد را — چوں نباشد ضد نبود جز بقاء (دفتر ششم)

Marfat.com

کیا یہ پھر حقیقت ارتقاء (Fact of Evoulution) کی تائید نہیں جسے مسئلہ ارتقاء کا تجزیہ کرتے وقت شق اوّل قرار دیا ہے۔

اس مضمون کا باقی حصہ جو ہے وہ اس کے لادینی نقطہ نظر کی تردید ہے، جس سے ہم کو بھی اتفاق ہے۔ لیکن وہ تو اختلاف ہوا، عوامل ارتقاء سے نہ کہ حقیقت ارتقاء سے یعنی شق دوم سے نہ کہ شق اول سے۔ اس امر کی تردید تو علمائے ارتقاء بھی اپنے نقطہ نظر سے کرتے رہے ہیں۔ ڈارون نے انتخاب طبیعی (Natural Selection) کی خارجی علت پر جو زور دیا اور اسے ارتقاء کا قوی ترین عامل مان لیا اور جسمانی، ذہنی اور نفسی فعلیتوں کی تشریح علت و معلول کی میکانکی نقطہ نظر سے کی۔ لامارک (Law Mark) نے حیوانات کے عضوی ارتقاء کو تنہا خارجی ماحول کا نتیجہ قرار نہیں دیا بلکہ حیوانات کی

ترجمہ: ممتاز دانش ور اور مترجم سعید بدر نے ان اشعار کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

"جب تو غور کرے تو یہ جہاں پوری جنگ ہے، ذرّہ، ذرّے کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا کہ دین کے ساتھ کافری۔ ایک ذرّہ بائیں طرف اُڑتا ہے تو دوسرا طلب میں دائیں کو پرواز کرتا ہے۔ ایک ذرّہ اُوپر کو دوسرا نیچے کو، رجحان میں اُن کی عملی جنگ کا مظاہرہ دیکھ! عملی جنگ، مخفی جنگ کی وجہ سے ہے۔ اس اختلاف کو اُس اختلاف سے سمجھ لے۔ وہ ذرّہ جو سورج میں فنا ہو گیا اس کی جنگ حساب سے خارج ہو گئی۔

اس میں سے طبیعت کی حرکت اور سکون جاتا رہا کیونکہ ہم "اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں" ہم اپنے نور کے سمندر کی جانب لوٹ آئے اور ہم اصل کی رضاعت سے دودھ پینے والے بن گئے۔ یعنی ذرّوں کی باہمی کشمکش جنگ فعلی ہے۔ جنگ نہاں ذرّات کا اختلاف اللہ تعالیٰ کے مختلف اسماء وصفات کا مظہر ہونے کی وجہ سے ہے۔ ذرّہ کو جب مقام فنا حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اختلاف طبعی اس ذرّہ کی طرف منسوب نہیں رہتا۔ ذرّہ کے محو ہو جانے کے بعد اختلافِ طبعی سورج کی طرف منسوب ہوں گے۔

طبعی جنگ، عملی جنگ اور قولی جنگ، اجزاء کے درمیان خوفناک جنگ ہے۔ یہ دنیا اس جنگ سے قائم رہتی ہے۔ عناصر میں غور کرتا کہ مسئلہ حل ہو جائے۔

درحقیقت دنیا کی بنیاد اضداد پر ہے، لامحالہ نقصان اور نفع کے اعتبار سے لڑنے والے ہو گئے۔ تیرے احوال ایک دوسرے کے خلاف ہیں ہر ایک اثر میں ایک دوسرے کا مخالف ہے۔

یہ باہمی فنا کرنا ضد سے ضد کو پہنچنا ہے۔ جب ضد نہ ہو تو بقاء کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

روح کا گوہر چونکہ ان اضداد سے جداگانہ چیز ہے۔ اس کی خصلت یہ نہیں ہے۔ خدائی خصلت ہے۔

"اُن جنگوں کو دیکھ جو صلحوں کی اصل ہیں۔ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کی جنگ صرف اللہ کیلئے ہے۔"

Marfat.com

کوشش کو بھی ارتقاء کا عامل قرار دیا۔ خارجی ماحول صرف ایک مہیج (Stimulus) کے طور پر کام کرتا ہے۔ لیکن اس مہیج کے سلسلے میں حیوانات جو جوابی طرزِ عمل (Response) اختیار کرتے ہیں ان میں ان کی اپنی ارادی کوششوں کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ لامارک نے زرافہ کی مثال دے کر بتایا کہ اس جانور کی گردن ابتدا میں لمبی نہیں تھی۔ اس نے جب چھوٹے چھوٹے درختوں کے پتے کھا کر انہیں ختم کر دیا۔ پھر اس نے اونچے درختوں پر پہنچنے کیلئے بہ تکلف کوشش کی اور گردن کو اونچا کیے رکھا تا کہ خوراک تک رسائی ہو سکے۔ جو افراد اس میں کامیاب ہوئے وہ زندہ رہے اور باقی ختم ہو گئے۔ اس مسلسل کوشش میں زرافہ کی نسل کی گردنیں لمبی ہوتی گئیں۔ لامارک کے بعد ویس مین (Weis Man) نے بھی ارتقاء کی داخلی علتوں کی طرف توجہ مبذول کرائی اور ڈارون کے اس خیال کی تردید کی کہ ارتقائے انواع محض ایک خارجی موثر (انتخاب طبیعی) کا نتیجہ ہے۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ ایک ہی قسم کے حیوانات میں خفی تغیرات (Variations) پیدا ہوتے ہیں۔ وہ افزائش نسل کے خلیوں میں خود بخود بغیر کسی خارجی علت کے پیدا ہوتے ہیں۔ ڈی ورائی (De Vries) نے ان خفی تغیرات (Variations) کے علاوہ جلی تغیرات یا تحول فجائی (Mutations) کا نظریہ پیش کیا۔ اس نے کہا کہ خفی تغیرات ارتقائے نوعی میں فیصلہ کن ثابت نہیں ہوتے۔ بلکہ جلی تغیرات یا تحول فجائی (Mutations) ارتقاء کی اصلی حالت ہوتے ہیں:

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے عملی دلائل ہیں جو ڈارون کے اس نقطہ نظر کی تردید کرتے ہیں۔ ہم وہ اس وقت بیان کریں گے جب اس مسئلہ کی دوم شق زیر بحث آئے گی۔ یہاں ان کے ذکر کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ محترم سید صاحب ہی نہیں بلکہ یہ مادیئین بھی ارتقاء کے عوامل کا تعین کرنے میں ڈارون سے اختلاف کرتے ہیں۔ لیکن یہ تاثر نہیں دیتے کہ وہ مسئلہ کی اول شق یعنی حقیقت ارتقاء کے بھی مخالف

Marfat.com

ہیں جو تاثر محترم سید صاحب اپنی تحریرات میں پہلی اور دوسری شق کو غلط سے غلط کر کے نا معلوم کس مصلحت کی بنا پر دینا چاہتے ہیں۔ نیز محترم سید صاحب کا موافقین ارتقاء پر طنز بے معنی ہے۔ کیونکہ مسئلہ ارتقاء کے جو موافقین ہیں وہ صرف اس کے اس حصہ سے اتفاق رکھتے ہیں جو کہ حقیقت سے متعلق ہے۔ پھر یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ انسانی سطح پر آ کر عوامل ارتقاء تبدیل ہو جاتے ہیں۔ دیکھئے اس سلسلہ میں ارتقاء کا ایک مسلمان موافق کیا کہتا ہے۔

''غیر ناطق حیوانات میں چونکہ ایمان کی انسانی طریق پر گنجائش نہیں اور عمل مقتضائے طبعیت ہے اسلئے فطرت کے حال و احوال کا ان ضروریات زندگی سے تطابق یا تخالف پذیر ہونا ہی ان کی صلاحیت یا عدم صلاحیت ہے، اور وہی جنس قوی تر یا صالح تر ٹھہرے گی جس کے وسائل دفاع کا توازن (جو فطرت نے اس کے سپرد کئے ہیں، قدرت کی خارجی اور اٹل طاقتوں کے ساتھ قائم رہے گا مگر تجامع انسانیہ کی حالت، جن کے ہر فرد کی ادنےٰ سے ادنےٰ ضرورت بھی تدبیر و عمل کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی، قطعی مختلف ہے۔ ان کے تحفظ و ارتقاء کا مسئلہ بے حد مشکل اور بدرجہا پیچیدہ تر ہے اور جوں جوں اقوام عالم ترقی کی تگ و دو میں ایک دوسرے سے سبقت لے جا رہی ہیں، انفرادی معیشت اور اجتماعی حفاظت کا سوال اور بھی لاینحل ہوتا جا رہا ہے۔ آج معاشرت کی اس حیران کن مسابقت میں تمدن کی لاانتہا ضروریات اور تہذیب کے ان گنت لوازمات جزو زندگی بن گئے ہیں۔ علم کی حیرت انگیز جدت آفرینی اور عمل کی محیّر العقول جولانی نے میدان حیات ناقابل گذر کر دیا ہے۔ ذرائع کی ناقابل یقین توسیع کے باوجود ذاتی آسائش مفقود اور بین الاقوامی امن ممتنع الحصول ہو گیا ہے، عمران و حفظان صحت کے التزامات نے آبادی کی المناک کثرت پیدا کر دی ہے۔ ہلاکت کے شہر شکن سامان اور بربادی کے کوہ پاش وسائل کا مہیا کرنا ہر متمدن قوم کا منتہائے عمل ہو گیا ہے۔ وہ روٹی کا ٹکڑا جو انسان کو نشاء اول میں قلیل سے قلیل سعی اور ادنیٰ سے ادنیٰ تدبیر کے باعث مل رہتا تھا، آج انتہائی جدوجہد کے بغیر میسر نہیں آتا۔ علاوہ ان مشکلات کے مادیت کے غلبے نے اقوام متمدنہ میں روحانیت سے عام انحراف پیدا کر دیا ہے، جس میں طاقت اور مادی اقتدار پر ناز، کبریائی کا اِدّعا اور بہیمی اخلاق سے تعلق، طبیعت ثانیہ ہو گئی ہے،

Marfat.com

مکر و دروغ مجامع عالم کا شعار بلکہ طغرائے امتیاز بن گیا ہے۔ بین الملی خلق اور اتحاد عالم کا نصب العین خواب و خیال ہو چکا ہے۔ طاقتور اقوام کی بہیمیت اور درندگی کی یہ شان ہے کہ ایک دوسرے کی تباہی کے ہولناک سامان روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ [1]

محترم سید صاحب مذہبی طبقہ کو یہ اثر دینا چاہتے ہیں کہ وہ تنہا واحد ایسے شخص ہیں جوان علوم سے متاثر نہیں ہوئے۔ لیکن میں عامتہ انسان کی معلومات کے لئے یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جتنے بھی موافقین ارتقاء ہیں وہ علوم کو قرآن کا خادم بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان نظریات کو قرآن پر مسلط نہیں کرتے۔ ابوالکلام آزاد جن پر محترم سید صاحب محض اس لئے طنز کرتے ہیں کہ ان کی تنقیص سے ان کی علمی فضلیت اور مذہبی حلقوں میں بھی ان کی مقبولیت ہو، لکھتے ہیں:-

آج کل ہندوستان اور مصر کے بعض مدعیان اجتہاد و نظر نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے، کہ زمانہ حال کے اصول علم و ترقی، قرآن سے ثابت کئے جائیں یا جدید تحقیقات علمیہ کا اس سے استنباط کیا جائے۔ گویا قرآن صرف اس لئے نازل ہوا ہے کہ جو بات کوپرنیکس اور نیوٹن نے یا ڈارون اور ولیس بغیر کسی الہامی کتاب کی فلسفہ اندیشیوں کے دریافت کر لی، اسے چند صدی پہلے معمول کی طرح دنیا کے کان میں پھونک دے اور پھر وہ صدیوں تک دنیا کی سمجھ میں نہ آئیں۔ یہاں تک کہ موجودہ مفسر پیدا ہوں اور تیرہ سو برس پیشتر کے معمے حل فرمائیں۔ یقیناً یہ طریق تفسیر بھی ٹھیک ٹھیک تفسیر بالرائے ہے۔ [2]

علامہ مشرقی مسئلہ ارتقاء کو نہایت بسط و شرح اور علم و دلیل سے پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

"..........اور نہ مسئلہ ارتقاء کو صحیح فرض کر کے قرآن کی صحت کو ثابت کرنا ہمارا پیش نہاد ہے۔"

---

[1] تذکرہ جلد اول از علامہ عنایت اللہ خان المشرقی

[2] نزول قرآن کے بعد جو علمی اکتشافات ظہور میں آئے یا آئندہ آئیں گے، ان کے متعلق ہمارا رویہ کیسا ہونا چاہیے؟ اس سوال کا جواب ہم نے اس مقدمہ قرآن میں مختلف مقامات پر دیا ہے۔ قارئین کرام اس کو پیش نظر رکھیں۔

Marfat.com

محمد ناصر الملک مرحوم سابق والئی چترال اپنی کتاب صحیفہ التکوین کے ''تعارف'' میں لکھتے ہیں:-

''بعضے از دوستاں مے پندارند کہ منتہائے مقصد از تصنیف ایں رسالہ تطبیق مسائل قرآنیہ بانظریات جدیدہ فلسفیہ است و برہمیں زعم خود ایں اعتراض رامبنی مے کنند کہ نظریات جدیدہ ہنوز بپایۂ ثبوت نرسیدہ۔ اندریں صورت آیات قرآنی راباآں تطبیق دادن و برآن محمول نمودن قبل از وقت و موجب ضعف در عقائد ملت خواہد بود۔ حاشا وکلا کہ کلام پاک اوحق سبحانہٗ وتعالیٰ محتاج تطبیق باشد۔ ممکن نیست کہ کدام مسلمان کہ ایمان برحقانیت قرآن داشتہ باشد ایں اندیشۂ فاسدہ را دردل خود یک لحہ ہم جائے دہد۔ حقیقت ایں فلسفہ حکمارا خواہ قدیم باشد یا جدید فخر برآن است کہ احیاناً بعض نظریات آں مطابق ارشاد حق سبحانہ وتعالیٰ باشد۔

ما ان مدحت محمدًا بمقالتی لکن مدحت مقالتی بمحمد

لیکن کسی کو جویائے معارف قرآنی است وبامسائل فلسفہ نیز شغف دارد۔ اگر درمیان ہردو تطابق مے بیند جرمش چیست؟ واگر معانی تنزیل بغیر تاویل بایک مسئلہ فلسفیہ توافق بپذیرد دراخفائے آں فائدہ یعنی چہ؟ من نیز چوں ایں مطابقت را مشاہدہ نمودم۔ شرح آں کردم بہ سلک نظم درکشیدم کہ طلاب علم عامہ مسلمین بغیر ازکراہت قلبی تحقیقات جدید را قبول نمائندہ وتنفر حقائق را از خود دور سازند اگر باایں اعتذار ہم فرمان برسد۔

ترسم کہ ہمی رانی زورق بہ سراب اندر زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر

درجواب کریم امنا وصدقنا۔ حقیقت الحقائق وراء الوراء است کہ از نظر ظاہر بین محجوب است ومحجوب خواہد ماند اما در بارۂ مشاہدات عالم مادی عرض خواہم نمود۔

من سرمۂ رازی راازدیدہ فروشستم اسرار جہاں دیدم پنہاں بکتاب اندر (اقبالؒ)

اگر علامہ مسیحی مثل آلیورلاج یک آیت توراۃ رابزعم خود بافلسفہ جدیدہ تطبیق دادہ

Marfat.com

مے تواں گفت کہ معرکہ مذہب وحکمت مبدل بہ مصالحت ومسالمت گردید۔ چرامایاں ازیں حق محروم باشیم وبا ایں ہمہ شواہد آیات بینات اظہار حقیقت نہ کنیم ونائرہ فتنہ اختلاف مذہب وحکمت رافرونہ نشانیم؟

قرآن مجید بہ اعتقاد جملہ مسلمانان کلام قدیم حضرت رب العلمین است کہ تاقیامت غیرمبدل خواہد ماند وَاِنَّـهٗ لَـكِتَابٌ عَزِيْزٌ لَّايَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَامِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ پیشنیاں راست فرمودانہ۔

جمیع العلم فی القرآن لکن　　　تقاصر عنه افهام الرجال

ونیز گفتہ اند کہ معنی ہر لفظ از قرآن مجید در ہفتاد پردہ محجوب ومستور است وہر پردہ کہ ازاں واشود معنے جدید ہویدا مے شود کہ بالفاظ دیگر ظہور نو است۔۔۔۔ قرآن مجید یک آئینہ ایست کہ مردم ہر عصر حسب استعداد خود تا بہ حد کمال کہ منتہائے علوم مروجہ آن عصر است صورت کمالِ خود را اور آن مشاہدہ مے توانند نمود۔" [1]

اور ہم نے:-

یہ طویل تقریر کس مقصد کیلئے پیش کی، محترم سید صاحب کا ذکر کس لئے چھیڑا؟ مسئلہ ارتقاء کے سلسلے میں ان کی تحریرات کو کیوں پیش کیا؟ کیوں ان سے ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ ابہام وخفا سے کام نہ لیتے ہوئے طبیعی علوم (Natural Science) کے سلسلے میں بھی ویسی وضاحت اور جرات سے کام لیں جو کہ معاشرتی علوم (Social Science) اور معیاری علوم (Normative Science) میں ان کا مابہ الامتیاز ہے۔ علم کی اہمیت کے پیش نظر! شروع ہی میں "علم بالحواس" کے عنوان کے تحت علم کی قرآنی حکیمانہ کی تعریف آپ کو پیش کردی گئی تھی کہ علم وہ ہے جو

---

[1] صحیفۃ التکوین از محمد ناصر الملک

Marfat.com

سمع، بصر اور فواد سے حاصل ہو۔ اسی علم سے ایک طبعی قوت حاصل ہوتی ہے جس سے عالم قوم قوت اور غلبہ حاصل کرتی ہے۔ کسی امت یا قوم کی نشاۃ ثانیہ کیلئے علم کی اہمیت اور اس کا مقام کیا ہے۔ محترم سید صاحب کو یہ بتلانا سورج کو چراغ دکھانے کی مانند ہے۔ ہم سب میں سے بہتر وہ علم کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنو میں ۵ جنوری ۱۹۴۱ء کو ایک خطبہ بعنوان ''نیا نظام تعلیم'' دیا۔ اس میں لکھتے ہیں۔

علم اور امت کا رشتہ:۔

سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ اس دنیا میں امامت و قیادت (Leader Ship) کا مدار آخر ہے کس چیز پر؟ کیا چیز ہے جس کی بنیاد پر کبھی مصر امام بنتا ہے اور دنیا اس کے پیچھے چلتی ہے۔ کبھی بابل امام بنتا ہے اور دنیا اس کی پیروی کرتی ہے، کبھی یونان امام بنتا ہے اور دنیا اس کا اتباع کرتی ہے۔ کبھی اسلام قبول کرنے والی اقوام امام بنتی ہیں اور دنیا ان کے نقش قدم پر ہو لیتی ہے، اور کبھی یورپ امام بنتا ہے اور دنیا اس کی تبع بن جاتی ہے؟ پھر وہ کیا چیز ہے؟ جس کی وجہ سے امامت آج ایک کو ملتی ہے، کل اس سے چھن کر دوسرے کی طرف چلی جاتی ہے اور پرسوں اس سے بھی سلب ہو کر تیسرے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے؟ کیا یہ محض ایک بے ضابطہ اتفاقی امر ہے یا اس کا کوئی ضابطہ اور اصل مقرر بھی ہے؟ اس مسئلہ پر جتنا زیادہ غور کیا جائے اس کا جواب یہی ملتا ہے کہ ہاں اس کا ضابطہ ہے۔ اور وہ ضابطہ یہ ہے کہ امامت کا دامن ہمیشہ علم سے وابستہ رہے گا۔ انسان کو بحیثیت ایک نوع کے زمین کی خلافت ملی ہی علم کی وجہ سے ہے۔ اس کو سمع، بصر اور قوانین چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو دوسری مخلوقات ارضی کو یا تو نہیں دی گئیں یا اس کی بہ نسبت کمتر دی گئی ہیں۔ اس لئے وہ اس بات کا اہل ہوا کہ دوسری مخلوقات پر خداوند عالم کا خلیفہ بنایا جائے اب خود اس نوع میں سے جو طبقہ یا گروہ علم کی صفت میں دوسرے طبقوں اور گروہوں سے آگے بڑھ جائے گا۔ وہ اسی طرح ان سب کا امام بنے گا جس طرح انسان من حیث النوع دوسری انواع ارضی پر اسی چیز کی وجہ سے خلیفہ بننے کا اہل ہوا ہے۔''

Marfat.com

تقسیم امامت کا ضابطہ:-

اس جواب سے خود بخود دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ علم سے مراد کیا ہے؟ اور اس میں آگے بڑھنے اور پیچھے رہ جانے کا مفہوم کیا ہے؟ اس مسئلہ کا حل سمع، بصر اور فواد ہی کے الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ کلام الٰہی میں یہ تینوں لفظ مجرد سننے، دیکھنے اور سوچنے کے معنی میں استعمال نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ سمع سے مراد دوسروں کی فراہم کردہ معلومات حاصل کرنا ہے۔ بصر سے مراد خود مشاہدہ کر کے واقفیت بہم پہنچانا ہے اور فواد سے مراد ان دونوں ذرائع سے حاصل کی ہوئی معلومات کو مرتب کر کے نتائج اخذ کرنا ہے۔ یہی تین چیزیں مل کر وہ علم بنتا ہے جس کی قابلیت انسان کو دی گئی ہے۔ بر سبیل اطلاق اگر دیکھا جائے تو تمام انسان ان تینوں قوتوں سے کام لے رہے ہیں اور اسی وجہ سے مخلوقات ارضی پر خلیفانہ تسلط ہر انسان کو حاصل ہے۔ ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھیے گا تو معلوم ہوگا کہ جو انسان انفرادی طور پر ان تینوں قوتوں سے کم کام لے رہے ہیں وہ پست اور مغلوب رہتے ہیں۔ انہیں تابع اور مطیع بن کر رہنا پڑتا ہے، ان کا کام پیچھے چلنا ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے جو ان تینوں کے زیادہ کام لیتے ہیں وہ برتر و غالب ہوتے ہیں، متبوع اور مطاع بنتے ہیں، رہنمائی اور پیشوائی ان ہی کے حصے میں آتی ہے، مگر امامت ملنے اور چھننے کا ضابطہ معلوم کرنے کے لئے آپ کو اس سے بھی زیادہ تفصیلی نگاہ ڈالنی ہوگی۔ اس تفصیلی نگاہ میں آپ کو یہ حقیقت نظر آئے گی کہ ایک گروہ انسانوں کا امام اس وقت بنتا ہے جب وہ ایک طرف ان معلومات کا زیادہ سے زیادہ حصہ جمع کرتا ہے جو ماضی اور حال کے انسانوں سے حاصل ہوسکتی ہیں۔ دوسری طرف خود اپنے مشاہدے سے مزید معلومات فراہم کرنے میں لگا رہتا ہے۔ تیسری طرف ان دونوں قسم کی معلومات کو مرتب کر کے ان سے نتائج اخذ کرتا ہے اور پھر ان نتائج سے کام لیتا ہے۔ پہلے کی جو چیزیں غلط ہیں۔ کم از کم اس کے اخذ کردہ نتائج کے لحاظ سے غلط ثابت ہوتی ہیں، ان کی اصلاح کرتا ہے، پہلے کی جن چیزوں کا نقص کم از کم اس کے فہم کے لحاظ سے اس پر کھلتا ہے، ان کی تکمیل کرتا ہے اور جو نئی چیزیں علم میں آتی ہیں، ان سے اپنی حد وسع تک زیادہ سے زیادہ کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ صفات جب تک اسی گروہ میں دوسرے تمام انسانی گروہوں سے زیادہ رہتی ہیں وہی پوری نوع کا امام ہوتا ہے اور جو ان صفات کے اعتبار سے کمتر ہوتے ہیں۔ ان کیلئے اللہ کی

Marfat.com

امت تقدیر ہے کہ وہ اس کی اطاعت ہی کریں اور اتباع بھی۔ اگر قسمت کی یاوری نے اطاعت سے بچا بھی لیا تو ان کیلئے اتباع سے تو کوئی مفر نہیں ہوتا، خواہ جان بوجھ کر بالارادہ کریں، خواہ بے جانے بوجھے اضطراراً کریں۔ اس دور عروج کے بعد جب اس گروہ کے زوال کا وقت آتا ہے تو وہ تھک کر اور اپنے کیئے ہوئے کام کو کافی سمجھ کر مشاہدے سے مزید معلومات حاصل کرنے اور فواد سے مزید اخذ نتائج کی کوشش چھوڑ دیتا ہے اور اس کا تمام سرمایہ علمی صرف سمع سے حاصل شدہ معلومات تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب اس کیلئے علم کے معنی صرف جاننے کے ہو جاتے ہیں کہ پہلے جو معلومات حاصل کی گئی تھیں اور جو نتائج اخذ کئے گئے تھے وہ کیا تھے؟ اب وہ اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ جو علم پہلے حاصل کیا جا چکا ہے، وہ کافی ہے۔ اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں۔ پہلے جو نتائج اخذ کئے جا چکے ہیں وہ صحیح ہیں، ان میں کسی اصلاح و ترقی کا موقع نہیں، پہلے جتنی تعمیر ہو چکی ہے وہ مکمل ہے، نہ اس میں ترمیم ہی کی جا سکتی ہے اور نہ اس سے آگے مزید تعمیر ہی ممکن ہے۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر یہ گروہ خود امامت سے ہٹ جاتا ہے اور نہ ہٹنا چاہے تو زبردستی ہٹا دیا جاتا ہے۔ پھر جو دوسرا گروہ مزید اکتساب علم، مزید اخذ نتائج اور مزید تعمیر حیات کا عزم لے کر آگے بڑھتا ہے۔ امامت و قیادت اس کا حصہ ہوتی ہے اور وہ صاحب جو پہلے امام تھے، اب مقتدی بنتے ہیں، جو پہلے مُطاع و متبوع تھے اب مطیع و تابع بنتے ہیں، جو پہلے جیتے جاگتے قلم کے مالک اور دنیا کے استاد بنے ہوئے تھے، اب عجائب خانہ آثار قدیمہ میں بھیج دیئے جاتے ہیں تاکہ بیٹھے علوم اوائل کی تشریح کرتے رہیں۔

علم اور امامت کے اس رشتے اور پھر علم کی اس قرآنی تعریف کے پیش نظر جو اوپر کی گئی ہے طبعی علوم (Natural Sciences) کی بنیاد سمع، بصر و فواد پر ہوتی ہے۔ بلکہ سمع سے زیادہ بصر و فواد پر ہی ہوتی ہے۔ علم الحیات (Biology) ایک طبعی علم (Natural Science) ہے۔ مسئلہ ارتقاء بھی اس کے موضوعات میں سے ہے۔ علم طبقات الارض (Geology) اور علم الجنین (Embrology) بھی دونوں طبعی علوم ہیں جو کہ اس مسئلہ کی مساعدت میں ہیں۔ اب اگر کسی وقت کوئی علمی حقیقت یا علمی صداقت دریافت ہو تو اس کا ترک کرنا انتہائی مضر اور خطرناک ہے۔ ہم

Marfat.com

بجاطور پر ڈرتے ہیں کہ ہم علم جدید کے طول وعرض میں سے کسی غلط فلسفیانہ یا علمی تصور کو ایک قرآنی حقیقت یا ایک صداقت سمجھ کر اپنا نہ لیں۔ لیکن ہمیں یہ یادرکھنا چاہئے کہ کسی علمی حقیقت یا صداقت کو غلط سمجھ کر رد کر دینا بھی اتنا ہی خطرناک ہے جتنا کہ کسی غلط تصور کو حقیقت یا صداقت سمجھ کر اپنانا۔ کیونکہ جب ہم کسی علمی حقیقت یا صداقت کو غلط سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں تو ہم حق کو حق کی حمایت سے محروم کر دیتے ہیں اور اس طرح سے حق کو باطل بنا دیتے ہیں۔ نہ صرف اس حق کو جو بظاہر قرآن سے باہر ہے بلکہ اس حق کو بھی جسے ہم قرآن کے اندر اپنے پاس محفوظ سمجھتے ہیں۔ اگر ہم قرآن کو ہر شعبۂ علم میں اپنا رہنما بنالیں تو ہمیں کئی ایسے تصورات اپنانے پڑیں گے جن سے ہم اس وقت آشنا نہیں اور جنہیں ہم غیر اسلامی سمجھ کر رد کرتے چلے آئے ہیں اور کئی ایسے تصورات کو رد کرنا پڑے گا جنہیں ہم غلطی سے اسلام کا جز سمجھ رہے ہیں۔ اگر ہم علمی صداقتوں میں سے ایک صداقت کو بھی نظر انداز کریں گے ہم حق کو کمزور اور باطل کو طاقتور کریں گے کیونکہ ایک صداقت دوسری صداقت کو سہارا دیتی ہے اور بڑا نقصان پہنچے گا کہ وہ صداقت جسے ہم نے چھوڑ دیا ہے۔ باطل تصورات کے ساتھ مل کر ان کی زینت اور رونق کا سامان بنے گی اور فطرت انسانی کیلئے ایک جاذبیت رکھنے کی وجہ سے باطل کو دلکش بنائے گی اور باطل اسے حق کے خلاف استعمال کر کے حق کو نقصان پہنچائے گا اور کامیاب ہوگا۔ یہ صداقت جب تک منکشف نہیں ہوئی تھی، کفر کبھی اسے اپنی تقویت کے لئے کام میں نہ لا سکتا تھا۔ لہذا جب کوئی علمی حقیقت حکماء کے مسلمات کے طور پر ہمارے سامنے لائی جائے تو ہم پر فی الفور ایک بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اسے ہر قسم کی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بغیر کسی ابہام وخفا کے محض دلائل و براہین کی بنا پر رد وقبول کریں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا اور ان حقائق کو باطل سے ملوث کر کے کفر کو سونپ دیا تو وہ دشمن ہمارے خلاف انہیں اپنے کام میں لائے گا اور اگر ہم نے اس حقیقت کو اپنالیا اور باطل سے علیحدہ کر دیا تو وہ دشمن کے مقابلہ میں ایک

Marfat.com

آلہ حرب وضرب ثابت ہوگی۔ اسلئے کسی ایک علمی صداقت کا نظر انداز کرنا ایک گناہ عظیم ہے جس کی سزا سے ہم چھوٹ نہیں سکتے۔ ہم پہلے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر آئے ہیں کہ خالص کفر اور خالص باطل نہ جاذبیت رکھتا ہے اور نہ کامیاب ہوسکتا ہے۔ اپنی جاذبیت، دلکشی اور کامیابی کے لئے حق کے اجزا کو ساتھ ملاتا ہے۔ اگر ہم کفر سے حق کے یہ اجزا چھین لیں جنہیں وہ اسلام کے خلاف استعمال کر رہا ہے تو کفر اپنی موت خود مر جائے گا۔ اس طرح ہم نہ صرف کفر کی موت کا سبب بنیں گے بلکہ قرآن واسلام کی صداقت کا ایک ایسا بین ثبوت بہم پہنچائیں گے جسے دنیا نظر انداز نہیں کر سکے گی۔ ۱

Marfat.com

استفسارات

درس کے بعد اس موضوع کے متعلق سوالات کیے گئے۔ ہر سوال مع جواب درج ذیل ہے۔

سوال۔ قرآن میں تو لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "کُن" کہا اور دنیا پیدا ہو گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ارض و سمٰوات اچانک وجود میں آ گئے۔

جواب۔ قرآن میں ارض و سمٰوات کی تخلیق کے متعلق تو یہ لکھا ہے:۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ. (اسجدہ ۳۲ : ۴)

ترجمہ: اللہ ہی ہے جس نے ارض و سمٰوات کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں پیدا کر دیا۔ اس کی تشریح پہلے ہو چکی ہے۔ کن فیکون کے الفاظ تخلیق کائنات کے سلسلے میں اس مفہوم میں کہیں نہیں آئے کہ ادھر کن کہا اور ساری کائنات جیسا کہ موجودہ حالت میں ہے ظہور میں آ گئی۔ کن فیکون کے الفاظ جن آیات میں آئے ہیں وہ یہ ہیں:۔

وَاِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ. (البقرہ ۲ : ۱۱۷)

ترجمہ: "اور جب خدا کسی کام کا کرنا ٹھہرا لیتا ہے تو بس اتنا ہی اس سے کہتا ہے کہ ہو جا بس وہ ہو جاتا ہے۔"

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَاۤ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ. (النحل ۱۶ : ۴۰)

ترجمہ: ہم جب جس چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں تو بس اس سے ہمارا اتنا ہی کہنا ہوتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔

---

[1] قرآن اور علم جدید از ڈاکٹر محمد رفیع الدین

Marfat.com

اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ. (یٰسین ۳۶:۸۲)

ترجمہ: ''وہ تو بس جس چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔''

ان آیات میں یَقُوْلَ اور نَقُوْلَ کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری طرح یہ دو حرفی لفظ ''کن'' بولتا ہے اللہ تعالیٰ کا تلفظ زبان، ہونٹ، گلے، اعصاب، پھیپھڑوں اور ہوا کا محتاج نہیں۔ انسان کو سمجھانے کیلئے اس کے سوا قریب سے قریب پیرایہ بیان اور اسلوب تعبیر اور کیا اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اے بروں از وہم قال و قیل من　　　خاک بر فرق من و تمثیل من

ترجمہ: ''اے وہ اللہ! جو میری بات چیت، میرے کلام اور میرے وہم وگمان اور خیال سے بھی باہر ہے۔ میری تمثیل و مثال پر مٹی پڑے کیونکہ تُو تو بے مثال ہے اور بے نظیر ہے۔ تیری مثال نہیں دی جا سکتی ہے۔

مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ ادھر اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا اور ادھر معاً بلا توسط و توقف اس کا ظہور عملاً ہو گیا۔ لهٗ کا ضمیر اس چیز کی جانب ہے جس کا وجود ابھی خارج ہی نہیں ہوا لیکن علم الٰہی میں تو بہر حال موجود ہی ہے اور امر الٰہی کے اعتبار سے ماموروموجود میں کوئی فرق ہی زمانی حیثیت سے نہیں۔ ہر مامور کے معنی موجود ہونے کے ہیں اور ہر موجود کے معنی مامور ہونے کے ہیں۔ کُنْ فَیَکُوْن کا عمل ارتقاء کے منافی نہیں۔ بیج کو درخت، کاربن کو ہیرا اور قطرے کو گہر بننے کے درمیانی مراحل ہوتے ہیں۔ ہر مرحلہ اور ہر منزل کُنْ فَیَکُوْن کی رہین منت ہے۔

آدم کی پیدائش کے سلسلے میں فرمایا۔

خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ. (ال عمران ۳ : ۲۹)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا پھر اس کو کہا ہو جا پس وہ ہو گیا۔''

Marfat.com

کُنْ فَیَکُوْن کا اگر وہی مطلب ہو جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے اور خَلَقَ مِنْ تُرَاب کی حالت سے پہلے کُنْ فَیَکُوْن کے الفاظ آتے لیکن فرمایا کہ آدم کو پہلے مٹی سے پیدا کیا کُنْ فَیَکُوْن کے الفاظ بعد میں آئے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مٹی کے پیدا ہونے کے بعد کے مراحل بھی اللہ تعالیٰ کے قول "کُنْ" کے ذریعے ہوئے۔ تخلیق کا سلسلہ جاری ہے۔ یزید فی الخلق مایشاء [1] کا عمل بھی ہر آن ہو رہا ہے۔ ارتقاء کی ہر منزل بھی ایک تخلیق ہوتی ہے۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے اور اس کا سلسلہ لامتناہی۔ کائنات اور انسان کی تدریجاً تکمیل ہو رہی ہے۔ اس لئے کن فیکون کی صدا اب بھی آ رہی ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شائد کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُنْ فَیَکُوْن

تو کُنْ فَیَکُوْن کا مطلب اس قدر [2] ہوا کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کے وجود میں لانے کا ارادہ فرماتے ہیں وہ چیز مجرد ارادہ بغیر کسی توسط و توقف کے وجود میں آ جاتی ہے۔ اس کا آغاز اس کے درمیانی مراحل، اُس کی تکمیل ہر آن خدا کے قول "کُنْ" کا محتاج ہے۔ کُنْ فَیَکُوْن کے عمل کا رخ ارتقاء کی جانب ہے اور کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَأْن کا تقاضا ہے کہ خدا کی خلّاقی مسلسل، مائل بہ ارتقاء اور لامتناہی ہو۔

سوال: یہ عقیدہ کہ انسان ادنیٰ حیوانی حالت سے بتدریج ترقی کرتا ہوا اپنی موجودہ حالت تک پہنچا ہے اس کے اشرف المخلوق ہونے کے منافی ہے۔

---

[1] اللہ جو چاہتا ہے خلق میں زیادہ کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تخلیق میں اضافے کرتا رہتا ہے۔ ہر آن نئی تحقیق کرتا رہتا ہے۔ کائنات ایک تکمیل شدہ چیز ہے۔ کائنات شروع میں جس طرح بنی تھی اس طرح ہے اور اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ یونان قدیم کا کائنات کے متعلق سکونی تصور ہے۔ قرآن کائنات میں اضافہ ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ حق تعالیٰ اس کی تخلیق کرتا رہتا ہے۔ اس کا وجود اظہار ذات میں ہے۔ ایسی منتہائے نظر کے حصول میں (خطبات، سائنس کی تحقیقات جدید بھی کائنات کے اضافہ اور وسعت پذیری کی تائید میں ہیں۔ اس کی مزید تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔

[2] نیز اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ قرآن کا خدا صاحب ارادہ، ذی حیات اور صاحب اقتدار خدا ہے۔ یونان کے فلسفیوں اور دوسرے مشرکوں کے خدا کی طرح ایک بے جان مسلوب، الارادہ علت العلل نہیں۔

Marfat.com

جواب: نسل انسانی کے متعلق یہ عقیدہ کہ وہ ادنیٰ حالتوں سے ہوتا ہوا موجودہ حالت تک پہنچا ہے اگر اشرف المخلوق ہونے کے منافی ہے تو کیا نسل انسانی کے ہر فرد کی اپنی جگہ پر یہی حالت نہیں ہوتی کہ ایک حقیر پانی کے قطرہ سے، ایک نطفہ سے انسان کا بچہ بنتا ہے۔ اگر نطفہ سے انسانی بچہ کی حالت تک پہنچنا اس کی عظمت اور اس کے احترام و اکرام کے منافی نہیں تو اس کی نسل کا ایک ادنیٰ حالت سے گزرتے ہوئے موجودہ حالت تک پہنچنا کیوں کر اس کے اشرف المخلوق ہونے کے منافی ہو سکتا ہے؟ قرآن تو ہر فرد انسان کو اس کی پہلی حالت یاد دلاتا ہے کہ وہ ایک نطفہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کی کاریگری اور صناعی نے اسے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَكْفَرَهٗ. مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ. مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ. ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ. ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ. ثُمَّ اِذَاشَاءَ اَنْشَرَهٗ. (عبس ۸۰:۱۷-۲۲)

ترجمہ: ''انسان پر اللہ کی مار وہ کیسا ناشکرا ہے؟ اللہ نے اسے کس حقیر چیز سے پیدا کیا؟ نطفہ سے اسے پیدا کیا پھر اسے مناسب اندازے سے بنایا پھر اس کے لئے راستہ آسان کر دیا۔''

اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ. وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ ط قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ. (یٰسین ۳۶: ۷۷،۷۸)

ترجمہ: ''کیا انسان نے نظر اس پر نہیں کی کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا سو اس میں قوت خصومت پیدا ہوگئی اور ہمارے لئے مثالیں اور مضمون بیان کرتا ہے اور اپنی خلقت کو بھول گیا۔''

اس قسم کی اور بہت سی آیات ہیں۔ [1]

اب اگر فرد کا قطرہ منی والے جرثومہ سے پیدا ہونا اس کی عظمت کو ختم نہیں کرتا تو نسل کا جرثومہ سے پیدا ہونا بھی اس کی شرافت و بزرگی کو ختم نہیں کرتا۔ مسئلہ ارتقاء میں

---

[1] اس قسم کی آیات مزید ثبوت کا باعث ہیں کہ جس طرح فرد انسانی ان حالتوں سے ترقی کر کے موجودہ حالت تک پہنچا ہے۔ اسی طرح نسل انسانی بھی ادنیٰ حالت سے ترقی کر کے اعلیٰ حالت تک پہنچی ہے۔ اگر یہ نہیں تو استدلال کا تمام زور ختم ہو جاتا ہے۔ ایک انسان جواباً کہہ سکتا ہے اگر میں قطرہ منی سے پیدا ہوا تھا تو کیا ہوا؟ میرا باپ تو ایک ایسی عظیم الشان ہستی تھا جو آسمانی جنت سے نیچے آیا تھا۔

Marfat.com

"علم الجنین کی تائید" کے عنوان کے سورۃ مومنون (۲۳) کی آیت (۱۲:۱۴) کی تشریح آپ سن چکے ہیں جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کا جنین کن کن مراتب سے گذر کر انسانی بچہ کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اسے ذہن میں تازہ کریں۔ فرد رحم مادر کے اندر نسل انسانی کے تمام مراتب و مراحل کا اعادہ کرتا ہے۔

سوال: آپ نے طبعی علوم اور معیاری علوم کا ذکر کیا ان کا کیا مطلب ہے؟

جواب: علوم کی دو قسمیں ہیں۔ طبیعی علوم (Natural Sciences) اور معیاری علوم (Normative Sciences) طبیعی علوم اشیا کو جیسی کہ وہ ہوں بیان کرتے ہیں۔ ان کا کام مشاہدے اور تجربے کے ذریعے سے مظاہر قدرت کی نوعیت کو سمجھنا، ان کے متعلق قوانین معلوم کرنا، ان قوانین کی مدد سے مظاہر قدرت کے متعلق پیشگوئی کرنا ہے۔

طبیعی علوم (Natural Sciences):

طبیعی علوم کی تین قسمیں ہیں۔

(الف) مادی علوم (Physical Sciences)

(ب) حیاتیاتی علوم (Biological Sciences)

(ج) ذہنی یا نفسیاتی علوم (Mental Sciences)

(الف) مادی علوم:

بے جان مادے سے بحث کرتے ہیں۔ ان میں مادے کی ساخت اور اس کے افعال کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ مادے کے ان عناصر کی تحقیق کی جاتی ہے جن سے مادی اشیا بنی ہیں۔ ان قوانین کا سراغ بھی لگایا جاتا ہے جن کی رو سے یہ مادی عناصر آپس میں ملتے ہیں یا ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ ہم طبیعی طاقتوں (Physical

Marfat.com

(Forces) میکانکی (Mechanical) کیمیائی (Chemical) برقی (Electrical) اور حرارتی (Thermal) صورتیں ہیں جن سے جوہر (Atoms) سالمات (Molecules) سورج اور سیارے ہوتے ہیں، بڑھتے اور بنتے ہیں۔

(ب) حیاتیاتی علوم:

یہ زندگی اور جاندار اشیاء کے علوم ہیں اور ان حالات اور قوانین کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کے مطابق پودے اور حیوان زندہ رہتے اور نشو ونما پاتے ہیں۔ یہ علوم ان مختلف صورتوں کا مطالعہ کرتے ہیں جن کے تحت زندگی اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے اور اس بات کا پتہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مادی اشیا کس طرح غیر نامیاتی (Indorganic) صورتوں سے ترقی کر کے نامیاتی (Organic) اور زندہ صورتوں (Living Forms) تک پہنچتی ہیں۔

(ج) ذہنی یا نفسیاتی علوم:

یہ ذہن اور ذہن کی پیداوار کے سائنسی علوم ہیں۔ ان علوم میں یہ دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ زندہ عضویتوں (Living Organs) میں ذہن کس طرح کام کرتا ہے۔ ان علوم میں ذہن کی مختلف حالتوں، اس کے افعال وحرکات اور پیداوار کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یعنی یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ زندگی میں شعور (Conciousness) کے اضافے میں کیا فرق رونما ہوتا ہے؟ اور شعور کس طرح ابتدائی احساس سے خواہشات، خیالات، جذبات اور اعتقادات تک ترقی کرتا ہے؟ اور ان سے کس طرح فنون، لسانیات، ادبیات، سائنسی علوم، مذاہب اور سیاسیات پیدا ہوتے ہیں؟ ان تمام ذہنی علوم کی بنیاد ایک بنیادی ذہنی سائنس ہے جو ذہن کی ماہیت کو تفصیلی طور پر بیان کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جیسے کہ ہر انسانی (یا حیوانی) فرد میں

Marfat.com

عمل پذیر ہوتا اور نشو ونما حاصل کرتا ہے خواہ وہ افراد معمولی شخصیتیں ہوں یا غیر معمولی۔ ذہن کی یہ بنیادی سائنس نفسیات کہلاتی ہے۔

معیاری علوم(Normative Sciences):

معیاری علوم کا نقطہ نظر اور ان کی غرض وغایت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ان کا تعلق اشیا کی ہست و بود سے نہیں ہوتا بلکہ ان کی قدر و قیمت سے ہوتا ہے۔ وہ ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ فلاں اشیا یوں ہیں یا یوں نہیں بلکہ انہیں یوں ہونا چاہیئے۔ وہ اپنے معیاری اصولوں کی مدد سے ان کی قدرو قیمت کا جائزہ لیتے ہیں۔ مثلاً **علم الاخلاق** (Ethics) ایک معیاری علم ہے۔اس کا کام یہ دیکھنا نہیں کہ ہمارے افعال کیسے ہیں؟ بلکہ یہ کہ وہ کیسے ہونے چاہئیں۔ یہ علم ہمارے افعال کی اچھائی (یعنی ان کے اخلاقی معیار) کے متعلق فیصلہ کرتا ہے، اسی طرح جمالیات (Aesthetic) بھی ایک معیاری علم ہے۔ یہ ہمارے احساسات (Feelings) کے حسن وقبح سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ''خوب وزشت'' کا معیاری نقطہ نظر سے مطالعہ کرتا ہے، ان دونوں علوم کی طرح منطق بھی ایک معیاری علم ہے منطق کا موضوع فکر ہے۔اس کا کام یہ بتانا ہے کہ ہمیں کس طرح سے فکر واستدلال کرنا چاہیئے تا کہ ہم غلطیوں سے بچ سکیں۔اس کا تعلق فکر واستدلال کے معیار سے ہے۔اس کا کام فکر واستدلال کی صحت یا عدم صحت دیکھنا ہے۔

Marfat.com

قرآن قیامت تک انسان کا واحد دستور العمل ہے

یہاں مسئلہ ارتقاء کی اول شق یعنی حقیقت ارتقاء کی بحث ختم ہوتی ہے۔ مسئلہ ارتقاء کی باقی دو شقوں یعنی عوامل ارتقاء اور نتیجہ ارتقاء نیز ان کے علاوہ باقی چاروں نظریات پر تبصرہ وتنقیہ آئندہ کی مطبوعات میں ملاحظہ فرمائیں۔ اب ایک اہم بحث رہ گئی ہے۔

عمل ارتقاء کا ایک اہم قانون :-

بعض سطح بین لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن ساڑھے پندرہ سو سال پرانی کتاب ہے۔ آج کل کے تمدن اور معاشرت کے لحاظ سے اس کے قوانین اور اصول از کار رفتہ ہو چکے ہیں۔ موجودہ زمانے میں تجدید ترقی یافتہ اصولوں کی ضرورت ہے جو زمانے کے ارتقاء کا ساتھ دے سکیں۔ جو لوگ ایسے اعتراضات کرتے ہیں وہ ارتقاء کے قانون سے لاعلم ہیں۔ ارتقاء کی فطرت اور اس کے قوانین کی تبدیلیوں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قوانین ارتقاء اس صورت میں تبدیل ہوتے ہیں جب ارتقائی عمل کو کوئی نیا مرحلہ درپیش آئے۔ عمل ارتقاء جب تک اپنا ایک مرحلہ پورا نہیں کر لیتا، اس وقت تک کوئی نیا قانون وجود میں نہیں لاتا۔

جب کائنات صرف بے جان تک محدود تھی تو اس میں محض مادی فطرت کے قوانین جاری تھے۔ قانون جذب و دفع[1] (Law of Attraction & Repulsion) اور اس قسم کے دیگر طبیعی قوانین کارفرما تھے۔ کائنات ایسے طبیعی و کیمیاوی قوانین کی بنیاد پر ہزاروں اور لاکھوں برس تک چلتی رہی۔ ایسے قوانین اس

---

[1] قانون جذب و دفع کا مطلب ہے کہ مادی اجسام میں جو تغیرات آتے ہیں وہ کسی نہ کسی خارجی قوت یا اثر کے تحت ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ایک چیز ایک جگہ پڑی رہے تو وہیں پڑی رہے گی جب تک اسے خارج سے حرکت نہ ملے۔

Marfat.com

وقت تک حکمران رہے جب تک کہ نباتی زندگی کا کائنات میں ظہور نہیں ہوا۔ نیز ان طبعی اور کیمیاوی قوانین کے علاوہ کوئی نیا قانون بھی وجود میں نہیں آیا۔ جب ارتقاء کا پہلا مرحلہ ختم ہوا اور نباتی زندگی ظہور میں آئی تو اس ظہور کے ساتھ عمل ارتقاء کیلئے نئے قوانین وجود میں آئے جو عضوی زندگی (Organic Life) اور اس کی نشوونما سے متعلق تھے۔

ان اجسام میں **داخلیت** (Inter nality) پائی جاتی ہے۔ شاخ کو تراش دیں تو تراشیدہ شاخ اس جگہ سے پھر بڑھ آتی ہے جو کہ غیر ذی حیات اجسام میں نہیں ہوتا۔[1] اب ایسے قوانین کی حکمرانی کا دور شروع ہوا۔ پہلے کے طبعی اور کیمیاوی قوانین ختم نہیں ہوئے۔ ان کی حیثیت ذیلی اور ماتحتانہ ہوگئی۔ **نباتی قوانین اپنے تمام دور کیلئے تھے جو نباتی دور کے آغاز میں سے وجود میں آئے** اور اس وقت تک کارفرما ہے جب تک کہ **حیوانی زندگی کا** ظہور نہ ہوا۔ اس تمام دور میں ان قوانین کے علاوہ کسی نئے قوانین کا اضافہ نہیں ہوا کیونکہ وہ قوانین نباتی زندگی کے جمیع تقاضوں کو پورا کرنے والے تھے۔ یہاں تک کہ ایک نئی منزل کا آغاز ہوا جو حیوانی زندگی کے نمود سے شروع ہوئی۔ اس مرحلہ کے وجود میں آتے ہی مادی اور نباتی ارتقاء کے قوانین کے علاوہ نئے قوانین کا اضافہ ہوا۔ پہلے طبیعی، کیمیاوی اور نباتی قوانین معطل نہیں ہوئے، ان کی حیثیت، اس طرح ذیلی اور ماتحتانہ ہوگئی جس طرح نباتی قوانین کی حکمرانی کے قوت طبعی اور کیمیاوی قوانین کی ہوگئی تھی۔ پھر جب تک **حیوانی ارتقاء کی منزل ختم نہیں ہوئی کوئی نیا قوانین وجود میں نہیں آیا وہی قوانین حکمران**

---

[1] یہ داخلیت (Inter nality) نباتات کے مرحلہ سے شروع ہو جاتی ہے۔ حیوانی اور انسانی زندگی میں بڑھ جاتی ہے۔ ہر خلیہ اپنا شِل پیدا کر سکتا ہے اور اپنی نسل جاری رکھ سکتا ہے۔ بعض جانوروں کا اگر کوئی عضو علیحدہ کر دیا جاتا ہے تو اس کی جگہ معاً دوسرا عضو پیدا ہو جاتا ہے، سمندری انور (Newt) کا اگر پاؤں کاٹ دیا جائے تو نہایت قلیل عرصہ میں اس کاٹے ہوئے پاؤں کی جگہ نیا پاؤں نمودار ہو جائے گا۔ (Trition) ٹرائٹن کی آنکھ کا عدس (Lens) نکال دیں اس کی جگہ لینے کیلئے دوسرا عدس (Lens) پیدا ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

رہے جن سے حیوانی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ یہاں تک کہ کائنات میں حیوانی ارتقاء تکمیل کو پہنچا اور انسان کا ظہور ہوا۔ انسان کے ظہور کے ساتھ نئے قوانین ظاہر ہوئے ان قوانین ارتقاء کے ظہور میں آنے سے پہلے کے طبیعی، کیمیاوی، نباتی اور حیوانی قوانین معطل نہیں ہوئے بلکہ ان کی حیثیت عمل ۔۔۔۔۔۔ وقانون کے ۔۔۔۔ پہلی طرح ذیلی اور ماتحتانہ ہوگئی۔ انسان سطح پر جو قوانین ظاہر ہوئے اور اس سے قبل کی تمام سطحوں (مادی، نباتی اور حیوانی) پر جو قوانین وجود میں آئے تھے ان میں ایک نمایاں اور جوہری فرق ہے۔ ان سطحوں پر کائنات کے بے جان مادی اشیا اور جاندار ایک اجسام میں خلقاً اور فطرتاً ان قوانین کا علم ودیعت کر دیا گیا تھا۔ اسلیئے ان کی حیثیت محض مجبورانہ تھی۔ لیکن انسانی سطح پر آ کر مجبوراً حیثیت کو ختم کرنے کیلیے قوانین کا علم انسانی کی فطرت میں ودیعت نہیں کیا بلکہ نوع انسانی کے بعض منتخب افراد کے ذریعے سے انسان کو دیا گیا تاکہ قوانین کا علم بھی انسان کو پہنچ جائے اور انسان کی حیثیت کائنات کی باقی اشیا اور افراد کی طرح مجبورانہ نہ رہے بلکہ وہ ایک صاحب ارادہ واختیار ہستی ہو اس کی تشریح ''علم بالوحی'' کے عنوان کے تحت شروع میں گزر چکی ہے۔ وہ منتخب افراد جن کی وساطت سے قوانین ارتقاء انسانیت کیلیے دیئے گئے انبیاء کہلاتے ہیں۔

ان قوانین ارتقاء کے مجموعے کا جدید ترین (Latest) اور آخری (Last) ایڈیشن قرآن ہے۔ آپ نے قانون ارتقاء کے عمل کو دیکھ لیا کہ جب تک ایک مرحلہ پورا نہیں کر لیتا اس وقت تک کوئی نیا قانون وجود میں نہیں آتا بے جان مادی دور کے اندر جو قوانین رہے، وہ شروع سے لے کر دور کے آخری تکمیل مرحلے تک وہی رہے جب تک کہ نباتی دور شروع نہیں ہوا، کوئی نیا قانون وجود میں نہیں آیا۔ پھر نباتی دور میں جن قوانین کا اضافہ ہوا وہ نباتی دور کے شروع سے لے کر آخر تک وہی رہے۔ جب تک کہ حیوانی دور کا آغاز نہیں ہوا، کوئی نیا قانون وجود میں نہیں آیا۔ اب انسانی دور کے آغاز میں جو قوانین ارتقاء دیئے گئے ہیں وہ انسانی دور کے آخیر تک وہی رہیں گے۔

Marfat.com

اب کائنات ارتقائے انسانی کی منزل سے گزر رہی ہے۔ جب تک یہ مرحلہ پورا نہیں ہو جائے گا اور انسانیت کا ارتقاء مکمل نہ ہو جائے یہی قوانین رہیں گے، کوئی نیا قانون وجود میں نہیں آئے گا۔ یہ عمل ارتقاء کا بنیادی قانون ہے۔ جب تک یہ مرحلہ پورا نہیں ہو جائے گا اور انسانیت کا ارتقاء مکمل نہ ہو جائے یہی قوانین رہیں گے کوئی نیا قانون وجود میں نہیں آئے گا۔ یہ عمل ارتقاء کا بنیادی قانون ہے۔ اسلئے انسان کی معاشرتی اور تمدنی زندگی کا بنیاد جن قوانین ارتقاء پر اپنی آفرینش کی ابتدا میں تھی انہی پر انسانیت کے ارتقاء کی تکمیل تک رہے گی خواہ یہ عرصہ ہزاروں برس کا ہو یا لاکھوں برس کا، جس طرح کہ پہلے ہوتا رہا ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کا یہ کہنا جہالت ہے کہ قرآن مجید پندرہ سو برس پرانی کتاب ہے، زمانہ حال کا ساتھ نہیں دے سکے گی۔ قوانین ارتقاء چودہ پندرہ صد برس کیا، یہ تو ہزاروں اور لاکھوں برس تک کیلئے ہوتے ہیں۔

Marfat.com

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن
(اقبالؒ)

از تلاوت بر تو حق دارد کتاب
تو ازو کامے کہ می خواہی بیاب
(اقبالؒ)

Marfat.com

تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ
وَقُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝

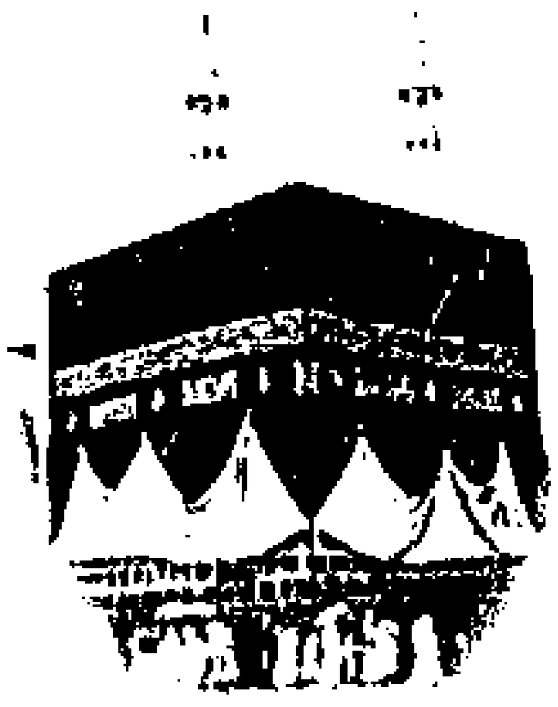

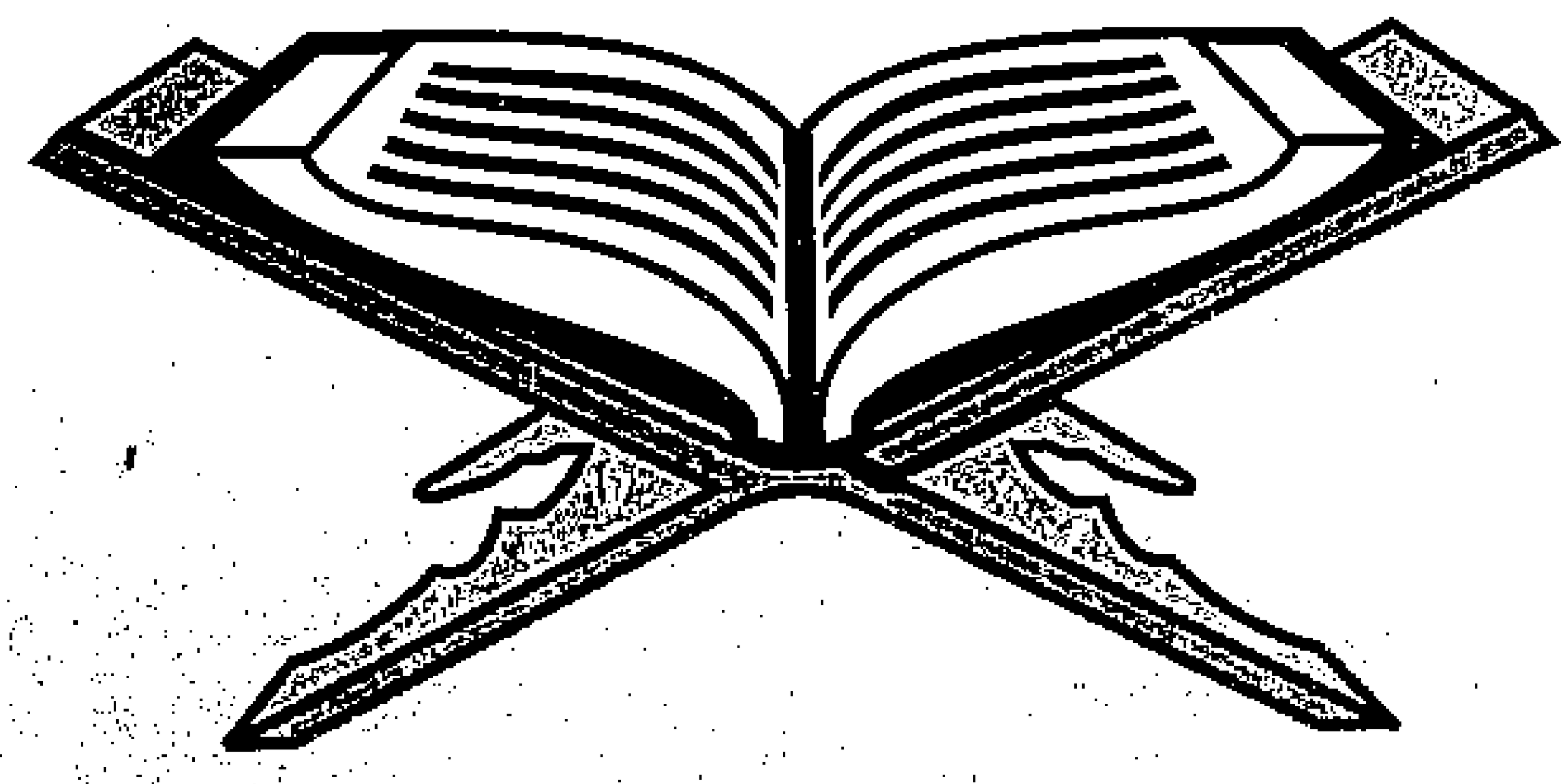

آیاتِ بیّنات

پروفیسر سید اللہ بخش الجیلانی

آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس

Marfat.com